نگار

قیمت ۴ر

تصانیف نیاز فتحپوری

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے اُردو میں جو درجہ قبولیت حاصل کیا اسکا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل ہوگئے قیمت علاوہ محصول عہ

گہوارۂ تمدن

مولانا نیاز کی وہ معرکۃ الآرا کتاب جس میں تاریخ اور اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ ارتقاء تمدن میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا ہے اور دنیائے تہذیب و شائستگی اسکی کسقدر ممنون ہے اُردو میں بالکل پہلی کتاب ہے قیمت علاوہ محصول عہ

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اسکی زبان اسکی تخیل اسکی نزاکت بیان اسکی بلندیٔ مضمون اور اسکی انشا سحر حلال کے درجہ تک پہنچی ہے قیمت علاوہ محصول عہ

فراست الید

مؤلفہ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی ساخت اور اسکی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت، شعور، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و نیکنامی وغیرہ کے متعلق صحیح پیشگوئی کر سکتا ہے قیمت علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کا تمام نشہ تجرش کیفیات اسکا ایک جملہ میں موجود ہیں یہ افسانہ اپنے بلاغت اور انشا کے لحاظ سے اسقدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ مل نہیں سکتی قیمت علاوہ محصول ۱ر

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کیساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے انکی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہوجاتا ہے اردو میں یہ سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بہترین نمونے اسمیں نظر آئیں گے قیمت

صحابیات

جسمیں عہد سعادت کی ۵۰ خواتین کی مستند حالات یکجا کردیے گئے ہیں۔ اسکا مقدمہ مولانا نے خاص اپنی انشا میں لکھا ہے اس کتاب میں بہتر صحابیات سے زیادہ صحابیات کے حالات درج ہیں طباعت و کتابت نہایت نفیس ہے قیمت علاوہ محصول عہ

نقاب اُٹھ جانیکے بعد

تین افسانوں کا مجموعہ جنہیں بتایا گیا ہے کہ ہر وہ چیز جو چمکتی ہے سونا نہیں۔ زبان و بلاغت انشاء و تخیل کے لحاظ سے تعریف فضول ہے اور حضرت نیاز کا نام ہی کافی ضمانت ہے

قیمت ۵ر

علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اسکو شروع کردیا آخر تک پڑھ لینا ہے اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں

قیمت ۱۲ر

علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں

۱۔ چند گمنام فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

۲۔ مادیین کا مذہب

۳۔ حرکت کے کرشمے

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے قیمت عہ

علاوہ محصول

تاریخ الدولتین

جرجی زیدان کے تاریخ تمدن الاسلام کی چوتھی جلد کا ترجمہ جسمیں عہد بنی امیہ و بنی عباس کی سیاسات پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ جرجی زیدان کی یہ کتاب بین الاقوامی شہرت حاصل کرچکی ہے قیمت عہ

علاوہ محصول

المسئلۃ الشرقیہ

مصطفیٰ کمال پاشا کی مشہور عالم کتاب کا ترجمہ یہ وہ کتاب ہے جس نے یورپ و ایشیا کے سیاسیات میں ہلچل ڈالدی تھی اور جس نے سب سے پہلے ترکی و مصر، عرب و حجاز میں انقلاب کی روح پھونکی۔ قیمت عہ علاوہ

محصول

دیگر مصنفین کی قابل مطالعہ کتابین

تذکرۂ خندۂ گل

مؤلفہ عبدالباری آسی جس میں ۳۰۰ صفحات سے زائد اُردو فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات معہ انکے لطائف و ظرائف معہ انتخابات کلام کے درج ہیں قیمت معہ محصول عہ

مثنوی لالہ رخ

طامس مور کی معرکۃ الآرا مثنوی کا مکمل ترجمہ ادبی شاہکار کا بہترین نمونہ قیمت معہ محصول عہ

مثنوی زہر عشق

مرتبہ مجنون گورکھپوری جسمیں ملک کے چار بہترین ادیبوں کا مقدمہ شامل ہے اور کئی تصویریں دی گئی ہیں ایک تصویر رنگین ہے

فراست التحریر مکمل

یعنی اُردو و انگریزی رسم خط اور انداز تحریر دیکھکر ایک شخص کی سیرت چال چلن مستقبل اور تمام حالات معلوم کرلینا اُردو میں بالکل پہلی کتاب قیمت ۸ر

علاوہ محصول

نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ ر تاریخ تک شایع ہوتا ہے
رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ ر تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے۔ ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا
سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ (سے)
بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد ۲۶	فہرست مضامین دسمبر ۱۹۳۴ء	شمارہ ۶

ملاحظات ———— ۲
ہماری عورتوں کا پردہ ———— محمد اعظم ———— ۹
مکتوبات نیاز ———— ۲۸
مصطفیٰ کمال کی زندگی کے چند دلچسپ اوراق ———— ۳۷
بیراگ کا بروگ ———— ۵۲
چار مصلح ———— فضل حق قریشی دہلوی ———— ۵۹
باب الاستفسار ———— ۶۱
مطبوعات موصولہ ———— ۶۵
منظومات ———— نظیر، مخدوم، نصرت، شمیم، اثر، مجاز، تپش، اختر ———— ۷۳

نگار

اڈیٹر:— نیاز فتحپوری

جلد ۲۶	دسمبر ۱۹۳۴ء	شمار ۶

ملاحظات

آصف جاہ سابع کی غیر معمولی شخصیت

حیدرآباد سے میرا تعلق روحانی تو اب سے بیس سال بیشتر ہی قائم ہو چکا تھا جب وہاں کے بعض علم دوست امراء نے میری ناچیز تصانیف کو بہ نظر استحسان دیکھ کر شرفِ قبول عطا کیا تھا، لیکن تعلق ظاہری کو بھی تقریباً دس سال کا زمانہ گزر چکا ہے (کیونکہ اول اول ۲۵ء میں مجھے وہاں جانے کا اتفاق ہوا) اور اب کہ گزشتہ ۶، ۷ برس سے سال کے بارہ مہینوں میں کم از کم مہینہ ڈیڑھ مہینہ میرا وہاں قیام کرنا لازمۂ حیات میں داخل ہو گیا ہے میرے لئے سرزمینِ دکن گوناگوں دلچسپیوں کا باعث ہو گئی ہے، یہاں تک کہ جب میں وہاں کے لئے رختِ سفر باندھتا ہوں تو اپنے اندر ایک خاص شوق و ولولہ محسوس کرتا ہوں اور جب جدا ہوتا ہوں تو وہاں کی یاد بہت دور تک میرا ساتھ دیتی ہے۔

ہندوستان کی مسلم آبادی کو جو تعلق دکن کے ساتھ پایا جاتا ہے، اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ دولتِ مغلیہ کی سطوت و جبروت بلکہ تمام مسلم شاہانِ سلف کی یادگار اب صرف یہی ایک سلطنت باقی رہ گئی ہے اور یہاں کے فرمانرواؤں میں مسلمانانِ ہند نے ہمیشہ اس

مرکزیت کو محسوس کیا جس کا فقدان حقیقتاً شیرازۂ اجتماعیت و قومیت کا فقدان ہے۔

پھر یہ حقیقت کس سے مخفی ہے کہ آج اکناف ہند میں علم و ادب کے کتنے ادارے، اور علم و تہذیب کے کتنے خانوادے ایسے ہیں جو سلطنت دکن کی فیاضیوں کے گرانبار نہیں اور وہ کونسا صاحب فضل و کمال ہے جس کے دماغی افکار کا ارتقاء شاہ دکن کے بذل و کرم کا منت کش نہ ہو۔

موجودہ فرمانروائے دکن (آصف جاہ سابع) کی حکومت کو صرف ۲۴ سال کا زمانہ گزرا ہے اور ہر چند کسی ملک کی اصلاح و ترقی، یا کسی قوم کے ذہنی و دماغی انقلاب کے لئے تاریخ عالم میں یہ مدت بہت کم تصور کی جاتی ہے لیکن اس مختصر زمانہ میں نہ صرف بہ لحاظ علم و ادب و صنعت و تجارت بلکہ بہ لحاظ نظم و سیاست بھی حیدر آباد دفعتہً اتنی بلند سطح پر پہونچ گیا ہے کہ ۲۵ سال قبل تصور انسانی میں بھی کبھی یہ بات نہ آسکتی تھی۔

کسی ملک و قوم کی ترقی یا انحطاط کا مسئلہ فن سیاست و تاریخ کا نہایت مہتم بالشان مسئلہ تسلیم کیا گیا ہے اور ارباب فکر نے ہمیشہ اس کی جستجو کی ہے کہ قوموں کے ذہنی انقلابات اور ممالک کے معاشرتی و دماغی رجحانات پر سب سے زیادہ اثر کس چیز کا پڑا کرتا ہے۔ حکومت شخصی ہو یا جمہوری ہر جگہ ایک ہی دل و دماغ کام کرتا ہوا نظر آتا ہے اور سوائے اس کے کہ ایک ہی چیز کے دو نام علیحدہ علیحدہ رکھ لئے گئے ہیں حقیقت کے لحاظ سے کوئی فرق پیش نہیں کیا جا سکتا۔ کہا جاتا ہے کہ آج دنیا میں جمہوریت و اشتراکیت کا دور دورہ ہے اور استبداد شخصی مٹتا جا رہا ہے، لیکن کیا جمہوریت ترکی کی معنوی حیثیت کو مصطفےٰ کمال کی شخصیت سے علیحدہ کیا جا سکتا ہے، کیا ایران کی موجودہ آزادی رضا شاہ پہلوی کے وجود سے بے نیاز ہو سکتی ہے، کیا جرمنی کا موجودہ سیلاب ترقی ہر ہٹلر کے علاوہ کسی اور چیز سے عبارت ہے، کیا اطالیہ کا استحکام سیاست مسولینی کی ذات کے علاوہ کوئی اور چیز ہے ــــ اور اگر تقدم شخصی کے ان محیر العقول کارناموں سے انکار ممکن نہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ سلطنت دکن کی موجودہ ترقیوں کو ہم آصف جاہ سابع کی اُس غیر معمولی شخصیت سے وابستہ نہ کریں جس کی حقیقی عظمت کا اندازہ صرف اسی وقت ہو سکتا ہے جب اس کا بہت قریب سے مطالعہ کیا جائے۔

عام انسانوں کی زندگی کے دو پہلو ہوا کرتے ہیں ایک پرائیویٹ دوسرا پبلک اور ایک کا اثر دوسرے پر نہیں پڑتا۔ لیکن چونکہ بادشاہوں کی زندگی اور ان کی زندگی کا ہر ہر لمحہ اُمور سلطنت پر اثر انداز ہوتا ہے، اس لئے فرمانروائے وقت کی پرائیویٹ زندگی بھی ملک عام ہو کر رہجاتی ہے اور اس کی ہر خلوت کا اثر اس کی جلوت پر بھی پڑا کرتا ہے۔ اس لئے ایک ملک کا عروج ہمیشہ شاہ کی ترقی اخلاق کا انعکاس ہوا کرتا ہے اور اس بنا پر اگر سلطنت دکن کی ترقی کو دیکھ کر اس کے فرمانروا کے ذہنی علو کا اندازہ کیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

یوں تو شاہ دکن کی عظیم الشان ہستی کے مطالعہ کا موقعہ وہاں کے حالات اور پبلک رجحانات کی وساطت سے ہر سال مجھے مل جایا کرتا تھا، لیکن امسال یہ درمیانی واسطے بھی اُٹھ گئے اور مجھے وہ بڑی سی بڑی سعادت بھی حاصل ہوگئی جس کی اس دنیا میں آرزو کی جا سکتی ہے۔

سب سے پہلے اعلیٰحضرت نے مجھے شاہزادہ مکرم جاہ بہادر کی تقریب سالگرہ میں یاد فرمایا اور اُس دربار سرور ونشاط میں شرکت کا موقعہ بخشا جہاں حال و مستقبل کے تین فرمانرواؤں کا اجتماع تھا۔ ایک تخت پر جلوہ افروز، دوسرا اس تخت کا دعاگو اور تیسرا گہوارہ میں۔ مراسم سالگرہ ادا ہو رہے تھے، جاہ و ثروت، دولت و امارت کے جتنے پرشوکت مظاہرے ممکن ہیں نظر کے سامنے تھے، مبارکباد کے ترانوں سے ایوان شاہی گونج رہے تھے ارکین حکومت وامرا سلطنت دست بستہ حاضر تھے اور اس تمام منظر پر صرف ایک ہستی چھائی ہوئی نظر آتی تھی جس کے نحیف و ناتوان جسم میں قدرت نے شیر کا سا دل ودیعت کر دیا ہے۔

اس کے بعد سالگرہ مبارک کے دربار میں مجھے یاد فرمایا گیا اور یہاں بھی ان آنکھوں نے دبدبۂ شاہانہ اور سطوت ملوکانہ کے وہ تمام مناظر دیکھے جو اس دور میں اب سوائے دکن کے اور کسی جگہ نظر نہیں آسکتے، لیکن فخر و مباہات کی ایک منزل اور باقی تھی خوش بختی و کامرانی کی ایک ساعت اور مقسوم ہو چکی تھی، چنانچہ جشن سالگرہ کے چند دن بعد سلسلۂ کرم بڑھا، اور الطاف خسروانہ نے ایک گھنٹہ سے زیادہ شرف خطاب و حضوری مرحمت فرما کر زندگی میں سب سے پہلی بار مجھے یہ سمجھنے کا موقعہ دیا کہ انسان کا حقیقی مرتبہ بہ لحاظ انسانیت کتنی بلند چیز ہے اور جب اس صفت سے کوئی بادشاہ متصف ہو جائے تو پھر وہ کس حد تک مافوق الانسان ہو جایا کرتا ہے۔

اعلیٰحضرت کی ذات گرامی اپنی علم دوستی، سادگیِ اخلاق اور نظم حکومت کے لحاظ سے اس وقت نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ہند کی دنیا میں بھی غیر معمولی شہرت حاصل کر چکی ہے اور وہ حضرات جن کو کبھی حیدر آباد جانے کا اتفاق ہوا ہے، انھیں تو وہاں کے ذرہ ذرہ سے یہ حقیقت آشکارا ہو گئی ہوگی کہ دورِ آصف جاہی کا عہد زریں "عہد عثمانی" ہی کے لئے مقسوم و مخصوص ہو چکا تھا۔ لیکن وہ لوگ جن کو مساعدتِ بخت سے ذات شاہانہ کی قدمبوسی اور تخاطب کا شرف حاصل ہو چکا ہے، اُن سے پوچھئے کہ "آصف جاہ سابع" کی ہستی کن کمالات و خصائص کا مرکز ہے۔

ٹھیک ۹ بجے صبح مجھے اذن باریابی ملا اور تقریباً ایک گھنٹہ تک شرف تخاطب حاصل رہا لیکن اس ایک ساعت کا ہر ہر لمحہ اس احساس سے لبریز تھا کہ اگر ذات شاہانہ کے مطالعہ کے لئے ساری عمر بسر کر دی جائے تو بھی اس کے فضائل و کمالات کا استقصا ممکن نہیں۔

سب سے پہلا اثر جو ذات ہمایونی کا انسان پر پڑتا ہے، وہ اخلاق کی سادگی اور اُس کا خلوص ہے۔ اور اسی لئے اعلیٰحضرت

کی نگاہ اولیں ایک ایسا غیر معمولی جذبۂ محبت و شیفتگی دل میں پیدا کر دیتی ہے کہ انسان بے اختیارانہ طور پر ایک فدایانہ کیفیت اپنے اندر محسوس کرنے لگتا ہے۔ وہ قرونِ اولی کے اکابر کی سی سادگی، وہ اعاظم اسلاف کی سی صداقت وہ قائدین ملت کی سی بزرگانہ شفقت و رافت - انسان ایسا محسوس کرتا ہے کہ وہ کسی اور فضا میں پہونچ گیا ہے اور دنیا کی معمولی سطح سے اُٹھا کر کسی ایسی بلند سطح پر اس کو پہونچا دیا گیا ہے جس کا ذکر افسانوں میں تو سُنا جاتا تھا لیکن آنکھوں سے اس نے نہ دیکھا تھا۔

دوسرا اثر جو اس سے بھی زیادہ انسان کو مسحور کر دیتا ہے وہ اعلیٰحضرت کی وسعتِ معلومات ہے۔ کوئی موضوع ہو، کوئی مبحث ہو، ایسی مدبرانہ و حکیمانہ تقریر فرماتے ہیں کہ مخاطب کو دم بخود رہجانا پڑتا ہے۔ جو لفظ زبان سے نکلتا ہے فاضلانہ، اور جو فقرہ ادا ہوتا ہے مجتہدانہ و عالمانہ۔ حافظہ کا یہ عالم ہے کہ جو چیز ایک بار نگاہ سے گزر گئی ہمیشہ کے لئے دماغ میں منقوش ہو گئی اور نُدرتِ بیان کی یہ کیفیت کہ جس مسئلہ کو جس پہلو سے اُٹھایا اسے دلنشین کر کے چھوڑا۔

قرآن و حدیث، تاریخ و فقہ، کلام و الٰہیات کا اتنا زبردست مطالعہ اعلیٰحضرت نے کیا ہے کہ شاید ہی یہ تبحّر کسی اور کو حاصل ہو اور پھر جس انشاء و ادبیت کے ساتھ ان تمام نوادر کو آپ پیش فرماتے ہیں وہ تو حقیقتاً سحر حلال کی کیفیت رکھتا ہے۔

چنانچہ اس زمانہ میں اُردو، فارسی اور بھاشہ کے ذریعہ سے جو جذبات بلند، اور تاثرات عالیہ اعلیٰحضرت نے پیش فرمائے ہیں ان کو دیکھ کر اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ دورِ حاضر میں علم و فضل کا یہ رتبۂ بلند صرف ذات "عثمانی" کے لئے مخصوص ہو چکا تھا اور اس میں کوئی دوسرا سہیم و شریک ذات ہمایونی ہو ہی نہیں سکتا۔

فارسی میں تو خیر اعلیٰحضرت کو صاحب زبان کا سا ملکۂ راسخ حاصل ہونا ہی چاہئے کیونکہ آصف جاہی خاندان سرزمین ہند میں قدم رکھنے کے بعد کبھی اس خصوصیت سے معرّا نظر نہیں آیا اور آصف جاہ اول (میر قمر الدین خاں شاکر) سے لیکر آصف جاہ سادس (میر محبوب علی خاں خلد مکان) تک ہر فرمانروا نے اس زبان میں نہایت پاکیزہ نمونے شاعری کے چھوڑے ہیں لیکن جن مطالب عالیہ اور جن رموز اخلاقی کو اعلیٰحضرت نے بیان فرمایا ہے، واقعہ یہ ہے کہ کسی اہلِ زبان کے بھی بس کی بات نہ تھی اور یہ طرۂ امتیاز صرف "ذات عثمانی" کے لئے ودیعت ہو چکا تھا۔

اعلیٰحضرت کا اُردو کلام اور پاکیزہ رنگ تغزل کا ذکر فضول ہے کہ ہندوستان کا ہر گوشہ اس سے واقف ہے، لیکن حیرت تو یہ ہے کہ اس دوران میں پورب کی ہندی بھاشہ میں بھی آپ نے ایسی ایسی البیلی ٹھمریاں سپرد قلم فرمائی ہیں کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ دکن میں بیٹھ کر اجودھیا کی چلبلی اور رسیلی زبان میں کیونکر ایسا ماہرانہ عبور حاصل ہو سکا۔ پھر اسی کے ساتھ جس عجیب و غریب جدت سے کام لیا گیا وہ یہ بھی کہ عاشقانہ مضامین کے ساتھ مناقب کے نازک و عمیق جذبات کو بھی حد درجہ حُسن و پاکیزگی کے ساتھ ظاہر کر کے ہندی لٹریچر میں ایسا بیش بہا اضافہ فرمایا کہ اس کی نظیر متقدمین کے کلام میں بھی کہیں نظر نہیں آتی۔

متاخرین کا کیا ذکر ہے۔

اعلیٰحضرت کی تیسری خصوصیت جس کا ہر زمانہ اور ہر طبقہ کی مذہبی دنیا میں فقدان رہا ہے، آزاد مشربی و روشن خیالی ہے جس حد تک راعی و رعایا اور حکومت و سیاست کا تعلق ہے، اعلیٰحضرت کا کوئی مذہب نہیں ہے یا یوں کہنا چاہئے کہ وہ ہر مذہب کے ماننے والے ہیں، چنانچہ اپنی عیسائی، ہندو، سکھ اور پارسی رعایا کے اکابر مذہب کے متعلق اعلیٰحضرت نے اپنے مختلف قطعات میں وقتاً فوقتاً جن جذبات کا اظہار فرمایا ہے اُن سے حیدر آباد کا ہر فرد واقف ہے۔ لیکن ذاتی حیثیت سے یقیناً وہ مخصوص عقاید کے ماننے والے ہیں اور اپنے ہر مذہبی نظریہ پر خود اپنی جستجو و کاوش سے درجۂ ایقان تک پہونچنے کی مجتہدانہ خصوصیت رکھتے ہیں۔ اعلیٰحضرت کو کورانہ تقلید اور تقلیدی مذہب سے کلی نفرت ہے اور ان کا ہر عقیدہ خود انھیں کی تحقیق کی بُنیان مرصوص پر قائم ہے۔

اعلیٰحضرت کے مذہبی عقاید پر اس دوران میں ملک کے اندر کافی ہلچل پیدا ہوگئی تھی اور ہندوستان کی صحافت نے جس کو آج تک کبھی تحقیق حق کی توفیق نہیں ہوئی اس مسئلہ کو بہت ہنگامہ خیز چیز بنا رکھا تھا، درانحالیکہ ان شور و غوغا کرنے والوں میں سے کسی ایک کو بھی اس کا صحیح علم نہ تھا کہ اعلیٰحضرت کیا فرماتے ہیں اور جو کچھ فرماتے ہیں وہ کس تحقیق انیق اور کس جذبۂ خلوص و صداقت کا نتیجہ ہے۔ کیا کوئی مسلمان ایسا ہے جو اہلبیت کی محبت سے اپنے دل کو خالی پائے، اور کیا جناب امیر کا علوئے مرتبت تاریخ و مذہب کا کوئی ایسا پیچیدہ مسئلہ ہے جس میں اختلاف آراء ہو سکے۔ پھر اگر اعلیٰحضرت نے صداقت کا اعلان صداقت ہی کی زبان میں کیا اور اس کی محبت وولا کا بے اختیارانہ اظہار آپ کی زبان و قلم سے بار بار ہوا تو کیا یہ کسی اصول دین کی ترمیم و تنسیخ تھی یا صرف اُس بھولے ہوئے درس کو یاد دلانا تھا جس کا ذکر کبھی کبھی زبانوں پر تو آجاتا ہے لیکن دل سے تراوش نہیں کرتا۔

حقیقت یہ ہے کہ سُنی و شیعہ دونوں جماعتوں کے افراد فرطِ عصبیت سے صحیح راستہ کو چھوڑ چکے ہیں اور اگر حضرات شیعہ کے نزدیک جناب امیر کی فضیلت صرف اسی طرح ثابت ہو سکتی ہے کہ دیگر صحابہ کو بُرا کہا جائے تو سنیوں کے یہاں بھی حضرت علی کے مرتبۂ بلند کا ذکر کرنا گویا خلفاء ثلثہ کی توہین کرنا ہے۔۔۔ یوں تو اہل سنت والجماعت بظاہر اس بات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ صاحب ذوالفقار بڑی پُر عظمت ہستی کے مالک تھے کیونکہ اس سے انکار حقیقت کا انکار، قرآن و حدیث کا انکار ہے، لیکن مجھے معلوم ہے کہ اس خیال کے آتے ہی وہ کس کشمکش میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور وہ جوش و ولولہ جو خلفاء ثلثہ کے فضایل بیان کرنے میں ظاہر ہوتا ہے، جناب امیر کا نام آتے ہی کتنا سرد پڑ جاتا ہے، کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر حضرت علی کے فضل و کمال کا پلہ ذرا بھی جھک گیا تو اُن کے مذہب کا شیرازہ درہم برہم ہو جائے گا، درانحالیکہ اگر مذہب واقعی رسول کی بتائی ہوئی کوئی چیز ہے تو جناب فاطمہ کے شوہر سے زیادہ اس کا سمجھنے والا کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ جس کا اعتراف خود خلفاء ثلثہ نے بھی کیا اور حضرت عمر نے تو یہاں تک کہدیا کہ "لَوْلَا عَلِیٌّ لَھَلَکَ عُمَرُ" (یعنی اگر جناب امیر کی ذات نہ ہوتی تو عمر ہلاک ہو جاتا) پھر تماشہ

تو یہ ہے کہ سُنّی اپنے آپ کو امام ابوحنیفہ کا مقلد تو ظاہر کرتے ہیں، لیکن اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ ابوحنیفہ خود علویین کے طرفدار تھے اور محض اسی طرفداری کی بدولت وہ قید و بند کی صعوبتوں میں گرفتار ہوئے ۔۔۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ سُنّیوں کی حیرت کا سبب یہ نہ تھا کہ افضلیت و ولایت جناب امیر کا مسئلہ کوئی اختراعی مسئلہ ہے، بلکہ حیرت اس بات کی تھی کہ ایک بادشاہ کے قلم سے کیونکر ان حقایق کا اظہار ہو سکا، حالانکہ وہ اگر اعلیٰحضرت کے مرتبہ سے پوری طرح آگاہ ہوتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ آصف جاہ سابع پہلے ایک مرد درویش ہے اور اس کے بعد بادشاہ، یعنی اگر وہ سرزمین دکن کے چند لاکھ نفوس پر دُنیاوی حکمرانی کر رہا ہے، تو اس کو یہ اہلیت تامہ بھی حاصل ہے کہ دکن اور دکن سے باہر کروڑوں مسلمانوں کے قلب پر فرمانروائی کرے، اپنے ارشادات روحانی سے، اپنے حکیمانہ اجتہادات سے، اپنے فیوض و کمال سے

وَذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ

شیعہ و سُنّی جماعتوں کی نزاع آج نہیں صدیوں سے جبینِ انسانیت کے لئے ایک شرمناک داغ بنی ہوئی ہے اور اس افتراق و انتشار کی خلیج کو جتنا کم کرنے کی کوشش کیجاتی ہے، اتنی ہی زیادہ وہ وسیع ہوتی جاتی ہے ۔۔۔ کیوں؟ ۔۔۔ صرف اس لئے کہ ان دونوں کو ایک مرکز پر لانے کے لئے اس وقت تک کوئی ہستی رونما نہ ہوئی تھی اور وہ بیچ کی کڑی جو ان دونوں زنجیروں کو آپس میں ملا کر "حبل المتین" بنانے والی ہے، مفقود تھی۔ لیکن اب کہ اعلیٰحضرت ایک طرف خلفاء ثلثہ کا بھی احترام کرتے ہیں اور دوسری طرف جناب امیر کے حقیقی فضل و کمال سے بھی دنیا کو روشناس کرنا چاہتے ہیں، ہمکو بہت کچھ اُمیدیں وابستہ ہیں اور ہو سکتا ہے کہ ان دونوں جماعتوں کو ایک دوسرے سے بغل گیر کرنے کی سعادت و برکت آصف جاہ سابع کے لئے مقسوم ہو چکی ہو اور دنیائے اسلام کی یہ وہ عظیم الشان خدمت ہے جس کی نظیر اسوقت تک کی تاریخ اسلامی میں کوئی دوسری نظر نہیں آسکتی۔

نیاز فتحپوری

جنوری ۳۵ء کے نگار کی خصوصیات

۱۔ اُردو شاعری پر شروع سے اسوقت تک جو کچھ لکھا گیا ہے وہ تذکروں، تاریخی کتابوں، ادبی تنقیدوں اور مختلف مضامین کی صورت میں اتنا منتشر، اسقدر کثیر ہے کہ کوئی ایک شخص نہ بیک وقت ان سب کو دیکھ سکتا ہے، نہ یاد رکھ سکتا ہے، لیکن جنوری ۳۵ء کا نگار اس موضوع پر اتنی جامع تالیف ہے کہ اس کے پاس رکھنے کے بعد آپ کو نہ کسی تاریخ و تذکرہ کی ورق گردانی کی ضرورت ہو سکتی ہے، نہ کسی اور تنقید و تبصرہ کے مطالعہ کرنے کی۔

۲۔ جنوری ۳۵ء کا نگار یوں سمجھئے کہ اُردو شاعری کے متعلق ایک ایسی انسائکلوپیڈیا ہے، جس میں اس موضوع پر آپ کے ہر سوال کا جواب بہ آسانی ملسکتا ہے۔

۳۔ قطب شاہی عہد سے لیکر اسوقت تک جتنے شاعر گزر چکے ہیں ان سب کا بہترین کلام اور اُن کی شاعری پر بہترین تاریخی و تنقیدی تبصرہ آپ کو جنوری ۳۵ء کے نگار میں نظر آئے گا۔

۴۔ اس میں بعض ایسے شاعروں کا کلام آپ کو ملے گا جن سے دنیا بالکل ناواقف تھی درانحالیکہ وہ اپنے عہد کے بے مثل کہنے والے تھے۔

۵۔ اس رسالہ میں خود جناب نیاز فتحپوری کے لکھے ہوئے تین چار تاریخی و تنقیدی مضامین شامل ہیں اور غالباً تنہا یہی خصوصیت اس اشاعت کو اہمیت بخشنے کے لئے کافی ہے۔

۶۔ وہ حضرات جو اُردو شاعری کے مطالعہ کا شوق رکھتے ہیں، یا وقتاً فوقتاً اس موضوع پر تنقیدی و تاریخی مقالے لکھنا چاہتے ہیں، نیز وہ طلبہ جو انعامی مقابلوں یا طیاری امتحان کے سلسلہ میں اُردو شاعری کے متعلق بہترین تاریخی و تنقیدی معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں، اُن کے لئے صرف اس رسالہ کا دیکھ لینا کافی ہے ——— تاہم ——— باوجود ان تمام خصوصیات کے نگار کے سالانہ خریداروں سے کوئی زاید قیمت نہیں لیجاتی۔ بس اس کے حصول کی بہترین تدبیر یہی ہے کہ جنوری ۳۵ء سے نگار کے سالانہ خریدار بن جائیے۔ ورنہ صرف جنوری ۳۵ء کا نگار حاصل کرنے کے لئے علاوہ محصول کے آپ کو دو روپیہ ادا کرنے پڑیں گے۔

منیجر نگار لکھنؤ

ہماری عورتوں کا پردہ

(بہ سلسلۂ ماسبق)

پردہ کے نقصانات

اس تمام بحث سے جو اب تک ہوئی اگر کچھ ثابت ہوا تو صرف یہ کہ پردہ غیر ضروری ہے۔ لیکن آپ کہیں گے کہ "ہماری معاشرت میں بہت سے غیر ضروری اجزا شامل ہیں۔ اس لئے اگر پردہ سے کوئی خاص نقصان نہ ہو تو اس کے برقرار رہنے میں کیا مضائقہ ہے؟" اگر فی الواقع پردہ صرف غیر ضروری ہوتا تو یہ کہنا صحیح تھا اور اس کے اُٹھا دئے جانے پر ہمیں اصرار کی کوئی وجہ نہ تھی۔ لیکن بد قسمتی سے ایسا نہیں ہے۔ پردہ ہماری سوسائٹی کے تمام افراد کے حق میں (خواہ وہ مرد ہوں یا عورتیں) جسمانی و ذہنی، اخلاقی و عمرانی ہر حیثیت سے سخت مہلک ہے۔ حامیانِ پردہ کا خیال ہے کہ پردہ کی بدولت ہماری سوسائٹی کو سب سے زیادہ اخلاقی اور جسمانی فائدے پہونچ رہے ہیں۔ یہ میں جانتا ہوں کہ "اخلاق" سے ان حضرات کی مراد صرف جنسی اخلاق ہے اور اس کے سوا انسانی سیرت کے جتنے محاسن ہو سکتے ہیں ان میں سے کوئی بھی لفظ "اخلاق" میں شامل نہیں۔ مثلاً جب آپ یہ کہتے ہیں کہ "یورپ کی اخلاقی حالت بالکل تباہ ہو گئی" تو اس سے آپ کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ یورپ میں لوگوں نے سچ بولنا بالکل چھوڑ دیا ہے یا ان میں ہمدردی باقی نہیں رہی یا وہ اپنے قول کے پابند نہیں رہے یا اُن سے حب وطن کا مادہ مفقود ہو گیا۔ بلکہ آپ کی مراد صرف یہ ہوتی ہے کہ وہاں عصمت فروشی بڑھ گئی ہے۔ گویا آپ اخلاق کو صرف جنسی اخلاق کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں حالانکہ اخلاق کا لفظ بہت وسیع ہے اور اس میں انسانی سیرت کے وہ تمام محاسن شامل ہیں جن سے پردہ کا نہ تو فی الواقع کوئی تعلق ہے نہ خود پردہ کے حامی کوئی تعلق سمجھتے ہیں۔ اس لئے ابتدا ہی میں ہم اسے واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ اس بحث میں ہم بھی جہاں کہیں 'اخلاق' یا 'اخلاقی حالت' کا لفظ استعمال کریں گے اُس سے صرف جنسی اخلاق مراد ہوں گے جو در اصل دیگر اوصاف انسانی کی طرح شجر اخلاق کی صرف ایک شاخ ہے۔

پردہ کے نقصانات اخلاقی اور جسمانی اعتبار سے

حامیان پردہ کا یہ خیال ہے کہ پردہ نے سب سے زیادہ فائدہ ہمارے ملک کی

اخلاقی اور جسمانی حالت کو پہونچایا۔ میں کہتا ہوں کہ پردہ نے سب سے زیادہ نقصان جس چیز کو پہونچایا وہ ہماری اخلاقی اور جسمانی حالت ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض درخت بالکل ٹیڑھے ہوتے ہیں۔ کبھی آپ نے غور کیا کہ اس کا کیا سبب ہے؟ جب کسی پودے کی قدرتی نشو و نما میں کوئی خارجی چیز حائل ہو جاتی ہے تو وہ صحیح راہ کے بجائے کسی اور طرف سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ بالکل یہی حال انسانی جذبات کا ہے۔ جب آپ کسی جذبہ کے قدرتی ذریعۂ تسکین کو بند کر دیتے ہیں تو یہ نہیں ہوتا کہ وہ جذبہ غائب ہو جائے بلکہ وہ قوی تر اور تند تر ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی تسکین کے لئے زیادہ نامناسب ذرائع نکالنے پر مجبور ہوتا ہے اب ذرا آپ قدرت کے ایک عالمگیر قانون پر نظر کیجئے۔ دو جنسوں کا باہمی اختلاط، فطرت کا وہ آئینِ مسلّم ہے جو اُس نے بقائے نسل کے لئے وضع کیا تھا۔ نباتات، حیوانات، چرند، پرند، غرض آپ کائنات کی کسی مخلوق کو لے لیجئے آپ کہیں یہ نہ دیکھیں گے کہ اس میں نر اور مادہ جدا کر دئے گئے ہوں۔ بکری ایک گھاٹ پر پانی پیتی ہو اور بکرا دوسرے پر، گائیں ایک چراگاہ میں چراکرتی ہوں اور بیل دوسری میں، اونٹ کو آتا دیکھکر سانڈنی کسی ٹیلے کی آڑ میں دبک جائے یا کسی ریچھ کو دیکھکر اس کی مادہ درخت کے پتوں سے منھ ڈھانک لے۔ یہی حال پرندوں کا ہے یہی مچھلیوں کا، یہی نباتات کا لیکن ان سب سے اشرف و ممتاز ایک مخلوق اور ہے جو اس قانونِ قدرت کے خلاف اپنا ایک قانون علیحدہ رکھتی ہے جو پردہ کہلاتا ہے اور جس کا مقصد یہ ہے کہ نوعِ انسان کی دو جنسوں میں ایک حدِ فاصل قائم کر دیجائے اس دور اندیش جماعت کے نزدیک دنیا میں نیکی کو عام کرنے کے لئے اس قانون قدرت کے خلاف ایک ایسا قانون اخلاق بنانا ضروری تھا جس کی رو سے ہر وہ شخص مجرم قرار دیا جائے جو جنس مخالف کے چہرہ پر ایک نظر بھی ڈال لے۔ مگر بدقسمتی سے اس ملائک صفت جماعت نے اپنا یہ قانون اخلاق مدون کرتے وقت اس امر پر بالکل غور نہیں فرمایا کہ قدرت کے قوانین بڑے سخت ہوتے ہیں اور جو شخص ان کی خلاف ورزی کرتا ہے اسے قدرت بڑی بیرحمی سے مسل ڈالتی ہے۔ واضعانِ پردہ کا بظاہر یہ منشا تھا کہ اس میں اتنی شدت کی جائے لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اور لوگوں نے دیکھا کہ اس سے بد اخلاقی کم ہونے کے بجائے اور بڑھ رہی ہے، تو انھوں نے پردہ میں اور سختی کی، اس سختی سے بد اخلاقی اور بڑھی یعنی پردہ بھی اور بڑھا یہاں تک کہ اب حالت یہ ہے کہ اگر اتفاق سے کوئی میری بیوی کی آواز بھی سن لے یا ایک جھلک دیکھ لے تو میں غصہ سے بیتاب ہو جاؤں گا۔ اسی طرح ہمارے اخلاق کی حالت یہ ہو گئی ہے کہ جس طرح ایک فاقہ زدہ کو

کھانے کے سوا کبھی اور بات کا خیال ہی نہیں آتا اسی طرح ہمارا دماغ ہر وقت عورتوں ہی کے خیال میں منہمک رہتا ہے۔ ہماری ساری دماغی فضا جنسی خیالات سے معمور ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر زیادہ نہیں تو کم سے کم ننانوے فیصدی اشخاص کو جنسی مالیخولیا ہو گیا ہے۔ خود جنسی تعلقات کے بارہ میں ہمارے خیالات نہایت بہت لغو ہیں اور اس پردہ نے جنسی نفسیات کو بالکل ستیاناس اور سراسر زہر آلود کر دیا ہے۔ جنسی خواہش، دیگر خواہشات انسانی کی طرح بقائے حیات اور بقائے نسل کا ایک ذریعہ ہے لیکن ہم اُسے ایک اہم، مفید فطری اور قابل احترام خواہش سمجھنے کے بجائے نہایت شرمناک۔ بیہودہ، فوق العادت اور مضحکہ خیز جذبہ سمجھنے لگے ہیں۔ اُس کا ذکر مہذب مجالس میں معیوب، اور اُس کی تعلیم سرکاری مدارس میں ممنوع قرار دی گئی ہے عوام اور جہلا درکنار اچھے تعلیم یافتہ حضرات بھی جنسی تعلقات پر ایک اہم اور غور طلب مسئلہ کی حیثیت سے نظر نہیں ڈالتے۔

ہمارے ان اہل الرائے حضرات کے نزدیک گھوڑوں، کتوں اور گایوں کی افزائش نسل کا مسئلہ تو بڑا اہم ہے جس پر خاص توجہ کی جاتی ہے اور جس کی خاص تعلیم دی جاتی ہے لیکن نسلِ آدم کی افزائش کے مسئلہ کو اہم سمجھنا اور اس کے متعلق سائنٹفک معلومات حاصل کرنا ایسی مضحکہ خیز حرکت ہے جو بھانڈوں کے سوا کسی اور کے شایان شان نہیں۔ یہی حال پردہ نے عورت کا بھی بنا دیا ہے۔ عورت ہمارے لئے ایک ایسا رازِ سربستہ ہے جو صرف سربستہ ہی نہیں بلکہ نہایت شرمناک اور ناگفتہ بہ بھی ہے۔ کسی مہذب محفل میں تو اس کا ذکر کیا ہی نہیں جاتا اور نامہذب محفلوں میں یا تو تمسخر و استہزا کے موقعوں پر کیا جاتا ہے یا ذلیل اور گندے خیالات کے ساتھ۔

آپ یقین مانئے کہ جب میں اپنے حلقۂ احباب پر نظر ڈالتا ہوں تو ان میں سے ننانوے فیصدی کو انہی گندے خیالات میں گرفتار پاتا ہوں۔ پردہ نے اُن کی جسمانی زناکاری کے مواقع کم کر کے اُنھیں ایسی سخت ذہنی زناکاری میں مبتلا کر دیا ہے جس سے شاید ہی کبھی نجات مل سکے۔ پھر اس میں بیاہے اور کنوارے جوان اور بوڑھے، جاہل اور تعلیمیافتہ اعلےٰ اور ادنےٰ کی کوئی قید نہیں۔ جسے دیکھئے اسی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔

ممکن ہے آپ اس بیان کو پڑھکر میرے حلقۂ احباب سے بدظن ہو جائیں اور یہ سمجھیں کہ میں نے اپنے شہر کے تمام اوباشوں کو اپنا دوست بنا لیا ہے ـــــ لیکن میں اپنے یا اپنے احباب کے حق میں کچھ نہیں کہنا چاہتا اور خود آپ کی راست گوئی پر اعتماد کر کے پوچھتا ہوں کہ آپ کا اور آپ کے احباب کا کیا حال ہے؟

اس کے جواب میں آپ حقیقت کو چھپانا چاہیں بھی تو نہیں چھپا سکتے - یہ حقیقت اب میرے یا آپکے اعتراف کی محتاج نہیں رہی اور ایک زمانہ اس سے واقف ہوگیا ہے - اگر بدقسمتی سے آپ کو کبھی کسی پارسی، ہندو یا اینگلو انڈین کے خیالات مسلمانوں کے جنسی اخلاق کے متعلق معلوم کرنے کا اتفاق ہوا ہے تو آپ کہہ سکیں گے کہ وہ لوگ اس بارہ میں مسلمانوں کے کس قدر مداح و ثنا خواں ہیں - آپ جتنا چاہیں اپنے منھ آپ میاں مٹھو بنیں لیکن اس افسوسناک حقیقت کو نہیں چھپا سکتے کہ غیر قومیں اپنی عورتوں کو آپ کے سایہ سے اتنی ہی دور رکھنا چاہتی ہیں جتنی ایک پردہ دار عورت اپنے بچہ کو آسیب کے سایہ سے - یہ تو آپ کا سلوک اُن عورتوں کے ساتھ ہے جو آپ کی دسترس سے باہر ہیں اب اُن عورتوں کا حال سنئے جن کو سوسائٹی نے آپ کے قبضہ قدرت میں دے رکھا ہے -

بیویوں کا احترام اخلاق کے اُن ابتدائی مسلمات سے ہے جن پر عمل کرنا مشرق و مغرب میں یکساں ضروری سمجھا جاتا ہے اور اُن تمام ملکوں میں جہاں پردہ رائج نہیں اس کا سختی سے لحاظ رکھا جاتا ہے۔ اسلام نے بیویوں کے حقوق کی جتنی حفاظت کی ہے اُس کی نظیر کسی اور مذہب میں کم ملے گی لیکن پردہ کی بدولت عورتوں کے یہ حقوق صرف کتابوں کے اوراق میں محفوظ رہ گئے اور عملی دنیا میں شاید ہی کوئی عورت ایسی مظلوم و بیکس ہو جیسی ایک ہندوستانی مسلمان بیوی ہے - مردوں نے یہ سمجھ کر کہ عورتیں نہ کہیں جا سکتی ہیں، نہ کسی سے دردِ دل کہہ سکتی ہیں نہ معاملاتِ دنیوی کو سمجھ سکتی ہیں اور نہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتی ہیں۔ اُن کے حقوق غصب کرنا اور ان کی ان کمزوریوں سے ناجائز فائدہ اُٹھانا شروع کیا۔ یہاں تک کہ اب یہ حالت ہوگئی ہے کہ ہمارے پچاس فیصدی سے زیادہ گھروں میں بیویاں زرخرید لونڈیوں سے بدتر ہیں - بدمزاجی، بدزبانی، سب و شتم، مارپیٹ، بیویوں کا مال ان کی خلاف مرضی بیچ دینا ان کی جائدادیں گرو کر دینا، ان کی رقمیں بنکوں سے نکال لینا اور اسی قسم کی سیکڑوں حرکتیں اس قدر عام ہوگئی ہیں کہ اگر اُن کا تفصیل سے ذکر کیا جائے تو یہ بجائے خود ایک مستقل عنوان ہو سکتا ہے۔ لیکن میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ اس بحث کے آغاز ہی میں ہم نے اخلاق کو صرف جنسی اخلاق تک محدود رکھنے کا تصفیہ کیا تھا اس لحاظ سے یہ واقعات ہمارے دامنِ اخلاق پر خواہ کیسے ہی بدنما داغ سہی لیکن ہماری اصل بحث سے خارج ہیں یہاں میں صرف جنسی اخلاق کی حد تک چند مثالیں دیکر اس اخلاقی جزو کو ختم کرنا چاہتا ہوں - جہاں تک اسلام کا تعلق ہے شوہر و زوجہ کی عصمت میں کوئی فرق نہیں رکھا گیا۔ زنا خواہ شوہر سے

سرزد ہو یا زوجہ سے یکساں مذموم ہے۔ یہی نقطۂ نظر مغربی ممالک کا ہے۔ وہاں زوجہ کو شوہر کی آوارگی پر نوٹس لینے کا ایسا ہی اختیار حاصل ہے جیسا شوہر کو زوجہ کی آوارگی پر، اور یہ اختیار آپ کی عورتوں کی طرح صرف زبانی نہیں بلکہ عملی بھی ہے۔ وہاں عورت جب چاہے مرد کی بے عصمتی ثابت کر کے اُس سے تعلق منقطع کر سکتی ہے اور کرتی رہتی ہے۔ اس کے برخلاف آپ کے جنسی اخلاق یہ ہیں کہ آپ تو معمولی سے شبہ پر اپنی بیوی کا گلا کاٹ سکتے ہیں، مگر آپ کی بیویاں اپنی آنکھوں سے آپ کی سیہ کاریاں دیکھ لیں تب بھی خون کے گھونٹ پینے کے سوا کچھ نہیں کر سکتیں۔ ہمیں تو اس کا پیدائشی حق حاصل ہے کہ جتنی عورتیں چاہیں لائیں اور اپنی بیوی کی چھاتی پر مونگ دلیں لیکن اگر ہماری بیوی کسی مرد کو جھانک کر دیکھ لے تو وہ سوختنی اور گردن زنی ہے۔ یہ تو اقدام کی صورت تھی اب مدافعت کی صورتیں لیجئے۔

ہماری سوسائٹی میں تعلق جنسی کے لئے شوہر کی خواہش کافی ہے اور اس کی قطعاً ضرورت نہیں کہ زوجہ کی صحت، حالت، رغبت اور رضامندی کا کچھ بھی لحاظ کرے، ہماری بیویاں خواہ کسی جسمانی عارضہ میں مبتلا ہوں یا کسی واقعہ سے متاثر ہوں لیکن یہ موانع کوئی چیز نہیں ہیں۔ اگر آپ اسے مبالغہ سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ ہماری معاشرت کی عملی دنیا میں ایسی صورتیں بکثرت پیش نہیں آتیں تو آپ اُس بدنام امریکن خاتون مس میو کی کتاب 'مادر ہند' کے اُس حصہ کا مطالعہ فرمائیے جس میں اُس نے ہندوستان کے زنانہ دواخانوں کے چشم دید حالات قلمبند کئے ہیں۔

بعض دفعہ تو آپ کو اس کا نہ صرف اختیار دیا جاتا ہے کہ آپ اپنی بیوی کے جذبات کا لحاظ نہ کیجئے بلکہ آپ ایسا کرنے پر مجبور کئے جاتے ہیں۔ ذرا اُس حجلۂ عروسی کا تصور کیجئے جہاں ایک ایسی بھولی بھالی لڑکی محوِ خواب ہے جسے جنسی معاملات سے بے خبر رکھنے کی انتہائی کوشش کی گئی تھی اور جو بیچاری صدق دل سے یہ سمجھتی ہے کہ اگر وہ اپنے قریب ترین عزیز کو بھی کسی طرح اپنا ستر دیکھنے کا موقع دے تو گویا ایک گناہِ عظیم کا ارتکاب کرے گی۔ ادھر تو اس غریب کی حالت اُدھر آپ اپنے جنسی اخلاق کے احکام سے مجبور ہو کر صبر کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتے کیونکہ اگر کہیں شامتِ اعمال سے آپ نے ایسا قصد فرمایا تو میکے اور سسرال اور برادری اور محلہ میں آپ کی رسوائی ظاہر ہے۔ اس بہیمانہ طرزِ عمل کے جو اثرات اس غریب لڑکی کے ذہنی کیفیات پر مترتب ہوتے ہیں۔ اُنکا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے۔ اور اس کے جو مسموم اثرات آپ کی بیوی اور اس کے توسط سے آپ کی اولاد پر پڑتے ہیں وہ محتاجِ بیان نہیں۔ اگر آپ انھیں حرکتوں پر اکتفا کرتے تو بھی خیر تھی مگر افسوس کہ قدرت کا انتقام اسی پر ختم نہیں ہوتا۔ اس بحث کے آغاز میں میں نے ایک جملہ لکھا تھا جسے آپ اجازت دیں تو یہاں دہراؤں

میں نے کہا تھا کہ "جب آپ کسی جذبہ کے قدرتی ذریعۂ تسکین کو بند کر دیتے ہیں تو یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ جذبہ غائب ہو جائے بلکہ وہ قوی تر اور تند تر ہوتا چلا جائے گا...... اور اگر اس پر بھی آپ اُسے کوئی راہ نہ دیں گے تو وہ اپنے نفاذ کے لئے نامناسب راستے نکالیگا" اس بیان کے پہلے حصہ کا آپ کو ثبوت مل گیا یعنی آپ نے یہ دیکھ لیا کہ مردوں کو عورتوں کی صورت دیکھنے کی ممانعت کرنے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے۔ اب میں آپ کو اس بیان کے دوسرے حصہ کا ثبوت دیتا ہوں۔ پردہ کی قید و بند کے بعد جن لوگوں کا عورتوں تک دسترس ہوتا ہے ان کا حال وہ تھا جو آپ نے سُنا، جن کا دسترس عورتوں تک نہیں ہوتا ان کا حال یہ ہے جو آپ اب سُنیں گے۔ ہماری سوسائٹی میں خلاف وضع فطری حرکتیں جسقدر عام ہیں وہ غالباً آپ سے مخفی نہوں گی۔ ان حرکتوں کی شہرت و مقبولیت کی زندۂ جاوید یادگار اُردو اور فارسی شاعری کا وہ ناپاک دفتر ہے جو علانیہ امرد پرستی پر فخر و ناز کر رہا ہے۔ آپ شاید یہ سمجھیں کہ میکشی اور شاہد بازی کی طرح یہ امرد پرستی بھی صرف شعرار کے دواوین میں رہتی ہے اور خارج میں اس کا کہیں وجود نہیں پایا جاتا تو یہ غلط ہے۔ ایران اور ہندوستان میں جب پردہ رائج ہوا تو اُس کے سایۂ عاطفت میں امرد پرستی اپنے اصلی اور عملی معنوں میں پھیلنی شروع ہوگئی۔ پردہ کے حامی نوع انسان کی دو جنسوں میں سے ایک کو تو مقید کر ہی چکے تھے اب اگر دوسرے کو بھی کر دیتے تو سارے ملک میں گھروں سے باہر سناٹا ہو جاتا جو عملی دنیا میں کسی طرح ممکن نہ تھا۔ اس لئے کرتے تو کیا کرتے؟ مجبوراً جہاں تک بنا کمسن لڑکوں کی نگرانی میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ مگر میں آپ سے اوپر عرض کر چکا ہوں کہ قوانین قدرت کا سیلاب کبھی ہمارے ان طفلانہ اور احمقانہ کوششوں سے نہیں رُک سکتا۔ اب ہمارے جذبات نے اپنے لئے ایک نیا مخرج تلاش کیا جو سب سے زیادہ آسان اور سب سے زیادہ مہلک ہے اور جسے اصطلاح عام میں استلذاذ بالنفس کہتے ہیں۔

اگر آپ کو پردہ کے انتظامات سے کچھ فرصت ملے اور آپ کبھی اپنے گرد و پیش پر ایک نظر ڈالنے کی زحمت گوارا فرمائیں تو غالباً ہمارے نوجوان طلبار کے کمھلائے ہوئے چہرے، دھنسی ہوئی آنکھیں، پچکے ہوئے گال، جھکی ہوئی کمر، لڑکھڑاتی ہوئی زبان اور ڈگمگاتے ہوئے قدم آپ کی نگاہوں سے نہ چھپ سکیں گے آپ جانتے ہیں یہ سب کس شجر مقدس کے ثمرات پاکیزہ ہیں؟ غالباً مجھے پھر اُس کا نام لینے کی ضرورت نہیں لیکن اتنا ضرور عرض کر دینا ہے کہ یہ وہ شجر مقدس ہے جس کے مسموم ثمرات دنیا کی بڑی سے بڑی قوم کو نیست و نابود کر دینے کے لئے کافی ہیں۔

سب سے آخر میں میں اُس ڈراؤنی چیز کی طرف آتا ہوں جس کے خوف سے آپ نے یہ ساری مصیبت مول لی تھی اور بتاتا ہوں کہ آپ کی تمام تدابیر حفظ ماتقدم کے باوجود وہ چیز ویسی ہی ڈراؤنی اور بھیانک ہے جیسے پہلے تھی۔ آپ سمجھتے ہیں کہ پردہ نے آپ کی سوسائٹی میں فحش کا بازار بالکل سرد کر دیا اور اب آپ اُن تمام خطرات سے محفوظ ہو گئے جو آپ کے نزدیک صرف بے پردہ قوموں کا حصہ ہیں۔ آئیے! میں ذرا آپ کو اس کی بھی سیر کرا دوں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اب تک ہندوستان کے کسی گوشہ میں مردوں پر پردہ عائد نہیں کیا گیا اور سوسائٹی نے انھیں نہ صرف اس کی آزادی دے رکھی ہے کہ جہاں چاہیں جائیں اور جن سے چاہیں ملیں بلکہ اُن کی نفسانی خواہشیں پوری کرنے کے لئے ایک خاص طبقہ بھی فراہم کر دیا ہے جس سے وہ عند الضرورت کام لے سکتے ہیں اور لیتے رہتے ہیں۔ یہ طبقہ خود اپنی اور دوسروں کی نظروں میں اسقدر ذلیل ہے کہ اس سے کسی جنسی اخلاق کی توقع نہ کی جاتی ہے نہ کی جا سکتی ہے اس لئے وہ طبقہ خود بھی کسی اخلاق کا ادعا نہیں کرتا اور بجز پیسہ کے ہر چیز کو اپنے دائرۂ اخلاق سے باہر سمجھتا ہے۔

اس صورت حال کا جو نتیجہ ہونا چاہئے تھا وہ ظاہر ہوا۔ اگر آپ کبھی تمام خانگی ویدوں، حکیموں، ڈاکٹروں اور اشتہاری دوا سازوں سے قطع نظر صرف کسی ایک دواخانہ کے شعبۂ امراض خبیثہ تک قدم رنجہ فرمائیں تو شاید اُس دن سے آپ اپنی اخلاقی حالت پر فخر کرنے کی زحمت گوارا نہ فرمائیں گے۔ پھر لطف یہ کہ جن مریضوں سے ملاقات کی شقاوت آپ کو وہاں حاصل ہو گی اُن میں سے آدھوں کی شادی ہو چکی ہو گی اور آدھوں کی ہونے والی ہو گی۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ تمام امراضِ شریفہ اُن سب خواتین محترم کے خون میں منتقل ہو چکے ہیں یا ہونے والے ہیں جن کے پردہ پر آپ کو اس قدر اصرار اور جن کی عصمت پر آپ کو اسقدر ناز ہے۔

آپ کے جنسی اخلاق کی یہ ستم ظریفیاں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ اُن پر ہنسیے یا رو دیجئے۔ آپ زنا کے تو سخت دشمن ہیں لیکن اُن عواقب و نتائج کے بالکل دشمن نہیں جن کی وجہ سے زنا حرام قرار دیا گیا ہے۔ گویا آپ گُڑ تو ڈھیروں کھائے جاتے ہیں مگر گلگلوں کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ اُن مہلک امراض کو (جنکی وجہ سے عورت کی عصمت اسقدر اہمیت رکھتی ہے) روکنے کی آپ کے پاس صرف یہی ایک تدبیر ہے کہ عورت کو پردہ میں مقید کر دیا جائے اور آپ اپنی ساری کوششیں اسی میں صرف کر دیتے ہیں۔ جب آپ کو عورت کے پردہ کی طرف سے اطمینان ہو گیا آپ سمجھے کہ حق ادا ہو گیا اور اب آپ پر کوئی ذمہ داری نہیں باقی رہی گویا آپ کے نزدیک قاضی صاحب کا ایجاب و قبول کرا دینا اُن تمام معاصی کا کفارہ ہے جو نکاح کے بعد کی

غلط کاریوں سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ آپ کے مرد چاہے مبروص ہوں ۔۔۔ مجذوم ہوں یا مدقوق ۔۔۔ مجنون ہوں یا دنیا بھر کے امراض خبیثہ میں مبتلا ۔۔۔ لیکن چونکہ ایک مستند قاضی نے دو گواہوں کی موجودگی میں انکا عقد کر دیا ہے اس لئے اب اُنھیں اس کی کامل آزادی حاصل ہو گئی ہے کہ اُس تندرست اور بے گناہ عورت کو جس نے پردہ کی قید میں گھٹ گھٹ کر اپنی عصمت برقرار رکھی ہے اس کی بلا رضامندی بلکہ خلاف مرضی پکڑ کر یہ تمام امراض اُس میں منتقل کر دیں۔ یہاں تک تو صرف اُن امراض کا ذکر تھا جو عورتوں کو بالواسطہ منتقل ہوتے ہیں اس پر اُن امراض کا اور اضافہ کیجئے جو براہ راست پردہ کی پیداوار ہیں اور جن سے ہر سال ہزارہا عورتیں لقمۂ اجل ہو جاتی ہیں۔ دق۔ سل۔ ضعف معدہ۔ خرابیِ جگر اور وہ سیکڑوں رحمی اور نسوانی شکایتیں جن سے شاید ہی مسلمانوں کا کوئی گھر خالی ہو، دراصل نتیجہ ہیں تنگ و تاریک مکانات میں رہنے، کھُلی ہوا میں نہ نکلنے، ورزش نہ کرنے، سیر و تفریح سے محروم رہنے اور اُس طائرِ پرشکستہ کی طرح گھُٹ گھُٹ کر جینے کا جسے کبھی کنجِ قفس سے باہر نکلنا نہیں نصیب ہوتا۔

مغربی ممالک اور ہندوستان کی اخلاقی اور جسمانی حالت کا مقابلہ

یہاں تک آپ کے مکارم اخلاق کا ذکر خیر تھا اب اگر آپ اجازت دیں تو ایک سرسری نظر اُن بے پردہ ممالک کی اخلاقی اور جسمانی حالت پر بھی ڈال لیجائے جو آپ کے نزدیک شیاطین کی بستیاں اور بدکاری کے گہوارے ہیں تاکہ آپ خود دونوں کا مقابلہ کر سکیں۔ آپ یہ تو جانتے ہوں گے کہ مغربی ممالک میں غیر فطری حرکتیں بہت کم ہیں اور ایسا ہونا چاہئے کیونکہ جب تک انسان کی فطری خواہشیں فطری ذرائع سے پوری ہو سکتی ہیں، وہ کبھی غیر فطری ذرائع اختیار نہ کرے گا۔ اس کے ساتھ ہی آپ کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ زنا خواہ کیسا ہی مذموم فعل سہی لیکن اتنا مذموم نہیں جتنا کہ یہ خلافِ فطرت طریقے ہیں۔ کیونکہ زنا صرف اُن قوانینِ اخلاق کی خلاف ورزی کا نام ہے جو معاشی اور عمرانی ضرورتوں کے لئے وضع کئے گئے ہیں اور خلافِ فطرت حرکتیں (جیساکہ اس کے نام سے ظاہر ہے) قوانینِ اخلاق و فطرت دونوں کے خلاف ہیں۔ اب رہا زنا اور اُس کے قبیح نتائج۔ چونکہ اس بارہ میں آپ میری رائے ہرگز تسلیم نہ کریں گے اس لئے میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ آپ کے نزدیک مغربی ممالک میں کتنی فیصدی عورتیں پاکدامن ہوں گی؟ ایک فیصدی؟ مشکل ہے۔ اچھا تسلیم۔ اور مرد کتنے فیصدی؟ صفر؟ اچھا یہ بھی تسلیم ہے اب یہ بتائیے کہ ہماری پردہ دار عورتیں آپ کے نزدیک

کتنی فیصدی پاکدامن ہوں گی؟ ننانوے فیصدی کم سے کم؟ یہ بھی میں نے مانا مگر یہ تو ارشاد ہو کہ ہمارے بے پردہ مرد کتنے فیصدی حقیقی معنوں میں پاکدامن ہوں گے؟ مشکل سے ایک فیصدی، وہ بھی محض آپ کی خاطر میں اتنے کے لئے تیار ہوں۔ اس اعداد و شمار کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ مغربی ممالک میں صد فیصدی مرد اپنی نفسانی خواہشیں ۹۹ فیصدی عورتوں سے پوری کرتے ہیں اور آپ کے یہاں ۹۹ فیصدی مرد ایک عورت سے (یا پھر غیر فطری ذرایع سے) یہ ایک فیصدی وہ عورت ہے جو ہماری سوسائٹی کے سب سے زیادہ پست و ذلیل طبقہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اب اگر آپ نے کبھی امراض خبیثہ کے اسباب پر غور کرنے کی زحمت گوارا فرمائی ہے تو معلوم ہو گا اسکا سب سے بڑا سبب ایک عورت کا کئی مردوں سے تعلق رکھنا ہے۔ اس لحاظ سے ہندوستان کی موجودہ صورت حال کا لازمی اقتضا یہ ہونا چاہئے کہ یہاں یہ امراض مغربی ممالک سے کئی گُنا زیادہ ہوں اور یہی ہو رہا ہے یہ ننانوے فیصدی مرد اُس ایک فیصدی عورت کے تمام جسمانی اور اخلاقی عوارض باقی ۹۹ فیصدی پاکدامن عورتوں میں منتقل کر دیتے ہیں میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ کسی ملک کی دو جنسوں میں سے ایک کا جسمانی یا اخلاقی امراض میں مبتلا ہونا دوسری جنس کو بھی ان امراض میں مبتلا کر دینے کے لئے بالکل کافی ہے خواہ وہ دوسری جنس بذات خود کتنی ہی پاکدامن اور باعصمت ہو۔ چنانچہ یورپ نے اسی خطرہ کو محسوس کر کے اس کے انسداد کی ایک نئی تدبیر نکالی ہے۔ آپ جرمنی کی خلاف نسواں تحریک سے تو بخوبی واقف ہیں اور نہایت شد و مد سے اُسکی حمایت کر رہے ہیں لیکن آپ کو اس کا بھی علم ہے کہ وہاں آج کل ایک اور تحریک اس تحریک سے زیادہ شدت سے پھیلی ہوئی ہے؟ اور وہ یہ ہے کہ جتنے مرد خطرناک متعدی امراض میں مبتلا ہوں وہ سب آختہ کر دئے جائیں آپ کو شاید معلوم نہیں کہ یہ تحریک جرمنی میں قانون کی صورت اختیار کر چکی ہے اور اس کا قوی امکان ہے کہ عنقریب دیگر ممالک مغرب میں بھی ایسا ہی قانون بنجائے لیکن یہ فرمائیے کہ کیا آپ اس تحریک کی بھی اُسی جوش و سرگرمی کے ساتھ حمایت کرنے کے لئے تیار ہیں؟ حالانکہ یہ خلاف نسواں تحریک کے بہ نسبت نوع انسان خصوصاً آپ کے ملک کے لئے بہت مفید ثابت ہو گی کیونکہ پردہ کی بدولت یہاں کنواری لڑکیاں ایسے امراض کے اندیشہ سے بڑی حد تک محفوظ ہیں۔ اس طرح پردہ کا اصلی فائدہ تو اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے۔ کہ ہندوستان میں یہ تحریک قانون کی صورت اختیار کرے اور اس پر نہایت سختی سے عمل کیا جائے۔ لیکن چونکہ یہ قانون مردوں کے حق میں سخت ہے اس لئے غالباً آپ اس کی تائید کرنے کے بجائے خدا کا شکر ادا کریں گے کہ ابتک ہندوستان کی گورنمنٹ کو ایسا بیہودہ خیال نہیں پیدا ہوا ورنہ خدا جانے آج سرکاری جراح کا نشتر ہم میں سے کن کن کی خبر

سے لے چکا ہوتا۔ البتہ اگر کسی طرح اس قانون کا شکار عورتیں بن سکتیں تو آپ اُسی مستعدی کے ساتھ اُسکی حمایت کے لئے تیار ہوجاتے جس طرح کہ آج تحریک مخالف نسواں کی تائید کے لئے تیار ہیں۔ غرض آپ کو معلوم ہوگیا کہ آپ کی جسمانی اور اخلاقی حالت جس پر آپ کو بڑا ناز تھا یورپ سے اتنی پست ہے کہ دونوں میں کوئی تناسب قایم ہی نہیں ہوسکتا۔

پردہ کے نقصانات ذہنی اعتبار سے

ذہنی اعتبار سے جو نقصانات پردہ کی وجہ سے مسلمانوں کو پہونچے ہیں اُن سے پردہ کا بڑے سے بڑا حامی بھی انکار نہیں کرسکتا اس لئے اس بحث کو زیادہ طول دینا ضروری نہیں معلوم ہوتا۔ نہ صرف تعلیمی حالت بلکہ تجربہ، عام معلومات، ذہانت اور امور دنیوی کی واقفیت میں ہماری عورتیں (یورپ کی عورتوں کا تو خیر ذکر ہی کیا) خود ہندوستان کی بے پردہ عورتوں کے پاسنگ بھی نہیں اور یہ ظاہر ہے کہ ایسی ماؤں کے آغوش شفقت میں جو اولاد پرورش پائیگی وہ کیسی قابل ولائق نکلے گی اسکے جواب میں پردہ کے حامی یہی کہے چلے جاتے ہیں کہ "عورتوں کو پردہ میں بیٹھکر تعلیم حاصل کرنے سے کس نے منع کیا ہے؟" لیکن اس پر غور نہیں فرماتے کہ عملی دنیا میں یہ کسی طرح ممکن بھی ہے یا نہیں۔ فرض کیجئے کہ میں اپنی ایک پردہ نشین لڑکی کو ڈاکٹری کی تعلیم دلانا چاہتا ہوں تاکہ وہ پردہ ہی میں رہکر خود کھانے کمانے کے قابل بھی بنے اور اپنی اولاد کی نگہداشت بھی بہترین طریقہ پر کرسکے۔ بتایئے اس کے لئے کیا صورت اختیار کیجائے؟ زنانہ میڈیکل کالج ہر جگہ نہیں ہے اب اگر فرض کیجئے دلی بھیجیں تو آخر وہاں پانچ سال تک اسکی نگرانی اور عفت وعصمت کی حفاظت کون کرے گا۔

ہمارے اس طرز عمل سے صاف ظاہر ہے کہ خود ہمیں اپنی عورتوں کی ذہنی حالت پر اس سے زیادہ اعتماد نہیں جتنا کہ ایک ناسمجھ بچے یا ایک مجنون پر ہوتا ہے۔ آخر اس کا کیا سبب؟ قدرت نے ہماری عورتوں کو بھی وہی دماغی اور ذہنی قوا عطا کئے ہیں جو مغربی عورتوں کو۔ پھر آخر ان میں باہم اتنا فرق عظیم کیوں ہے۔ ہماری عورتوں کی وہ حالت اور مغربی عورتوں کی یہ کیفیت کہ وہ کبھی آسمان کی فضاؤں میں اُڑتی ہیں تو کبھی سمندر کی تہوں میں پہونچتی ہیں۔ کبھی افریقہ کے مہیب جانوروں کا شکار کرتی ہیں تو کبھی امریکہ کے وسیع دواخانوں میں تیمارداری۔ جنگ کے زمانہ میں دشمنوں کا مقابلہ کرتی ہیں تو صلح کے زمانہ میں اپنے ملک کا سارا انتظام، وہ اپنے دوستوں کے حق میں فرشتۂ رحمت ہیں تو دشمنوں کے لئے قہر الٰہی قوم کی ہر مشکل اُن کے ناخن تدبیر کی محتاج ہے اور ملک کا ہر سررشتہ ان کے مساعی جمیلہ کا ممنون۔ ایک طرف وہ سائنس کے میدان میں نئی نئی تحقیقاتیں کرتی ہیں تو دوسری طرف فنون کی دنیا میں بیش بہا ذخیرہ بہم پہونچاتی ہیں۔

پردہ کے نقصانات معاشی اعتبار سے

معاشی اعتبار سے جو نقصان مسلمانوں کو پردہ کی وجہ سے برداشت کرنا پڑ رہا ہے وہ بالکل ظاہر ہے۔ آج شاذ و نادر کوئی مسلمان عورت اپنی ذاتی آمدنی رکھتی ہے ورنہ ۹۹ فیصدی سے زیادہ عورتیں صرف مردوں کی کمائی پر اپنی زندگی بسر کر رہی ہیں۔

جتنے پیشے اس وقت ہندوستان میں عورتوں کے لئے کھلے ہیں اُن سب میں غیر مسلم عورتیں بھری ہیں بجز ایک گداگروں اور طوائفوں کے کہ اُس میں تو بیشک مسلمان عورتوں کا نمبر از روئے تناسب سب سے بڑھا ہوگا۔ شریف عورتوں میں اول تو کوئی علم و ہنر ہی نہیں اور ہزاروں میں ایک آدھ کے ہاں اگر ہے بھی تو ہم لوگ اس سے کسی طرح کا مالی فائدہ اُٹھانا سخت معیوب سمجھتے ہیں خصوصاً اگر اُس کے لئے گھر سے باہر نکلنا پڑے۔ اس طرح قوم کی نصف آمدنی تو بالکل مفقود ہو گئی اب جو نصف بچی اُس میں قطع نظر اُن تمام فضول خرچیوں کے جن میں مسلمان عورتیں بطور خاص مشہور ہیں اور جو پردہ کے بالواسطہ نتائج ہیں بعض اخراجات براہ راست پردہ کی بدولت لاحق ہو رہے ہیں مثلاً ڈاکٹروں کی فیسیں اور دواؤں کی قیمتیں جو ہر مہینہ اُن امراض کے لئے ادا کرنی پڑتی ہیں جن کا گزشتہ اوراق میں ذکر ہوا اور جو خاص پردہ کی پیداوار ہیں یا مثلاً اُن سواریوں کا خرچ اور کرایہ جو ہماری عورتوں کے لئے ناگزیر ہیں۔ اگر آپ کی بیوی کو کہیں جانا ہی تو بغیر سواری کے ان کا گھر سے نکلنا ممکن نہیں خواہ فاصلہ کتنا ہی کم اور آپ کی مالی حالت کیسی ہی سقیم ہو۔ اسی طرح کے اور بہت سے خرچ ہیں جن کی وجہ سے مسلمانوں کی مالی حالت روز بروز بدتر ہوتی چلی جاتی ہے لیکن قطع نظر اس مالی نقصان کے جو مسلمانوں کو اور قوموں کے مقابلہ میں برداشت کرنا پڑ رہا ہے ایک سخت خرابی اُن کی معاشرت میں عورتوں کی معاشی غلامی کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہے جو تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔ ہندوستان کے مردوں کو اپنی عورتوں پر اتنے وسیع اختیارات صرف معاشی تفوق کی بنا پر حاصل ہوئے ہیں۔ آج ہماری عورتیں ہمارے مظالم جو اس خموشی کے ساتھ برداشت کر رہی ہیں ان کا سبب معاشی غلامی کے سوا کچھ نہیں۔ عورتوں کی اس بیکسی اور بیچارگی کو جنت الحمقا کے رہنے والے اُن کے غیر معمولی صبر و شکر اور ایثار و محبت پر محمول کر کر کے خوش ہوتے ہیں اور دوسری قوموں کی عورتوں پر اپنی عورتوں کی فوقیت جتاتے ہیں یہ نہیں سمجھتے کہ یہ سب معاشیات کے کرشمے ہیں۔ ورنہ ہماری عورتیں بھی دوسری عورتوں کی طرح انسان ہیں اور اُنھیں جذبات و خواہشات کی تابع رہینگی

جو سارے عالم میں یکساں کارفرما ہیں۔ ہندوستان کے مرد اس لئے عورتوں کے ساتھ مساوات نہیں برتتے کہ کوئی آقا اپنے ملازم کے ساتھ مساوات نہیں برتتا اور ہندوستان کی عورتیں محض اس لئے مردوں کی تابع ہیں کہ ہر خدمت گار اپنے آقا کا تابع ہوتا ہے۔ آج ہندوستانی عورتیں اس معاشی غلامی سے آزاد ہو جائیں پھر دیکھئے وہ کیسے مساوات کا دعوے نہیں کرتیں اور آپ کیسے ان دعووں کو تسلیم نہیں کرتے۔ پس معلوم ہوا کہ معاشی غلامی جسے دراصل ہندوستانی عورتوں کے تمام مصائب کی جڑ کہنا چاہئے صرف پردہ کا نتیجہ ہے۔

پردہ کے نقصانات عمرانی (Social) حیثیت سے

عام طور پر ہندوستانی گھروں میں بیوی کی عجیب حالت ہے وہ نہ تو صاحب خانہ کے برابر سمجھی جاتی ہے نہ ملازمین کے۔ مذہب، عقل اور معاشرت کا اقتضا یہ ہے کہ اس سے مساویانہ برتاؤ کیا جائے لیکن ذہنی، معاشی اور تعلیمی اعتبار سے وہ اس قدر پست ہوتی ہے کہ آپ چاہیں بھی تو اپنی بیوی کو برابری کا درجہ نہیں دے سکتے۔ کیونکہ خرچ کرنے والے کے حقوق کبھی کمانے والے کے برابر نہیں ہو سکتے اور ناسمجھ کو اختیارات سمجھ دار کے برابر نہیں دئے جا سکتے۔ اس کی وجہ سے ہماری گھریلو زندگی میں سخت کشمکش رہتی ہے اور انجام کار گو عورت ہی کو سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اس سے اُس کی ذہنیت اور آپس کے تعلقات پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ صرف یہی نہیں ہوتا بلکہ اس کے اثرات میاں بیوی سے گزر کر اولاد پر پڑتے اور وہ غریب سب سے زیادہ اس کشمکش کا شکار ہوتی ہے آپ روزمرہ اپنے گھروں میں دیکھتے ہوں گے کہ ماں بچوں کو ایک بات کی تاکید کرتی ہو اور باپ اس کے بالکل برعکس اُنھیں ایک دوسری ہدایت دیتا ہے۔ باپ کی رائے کو ماں صحیح نہیں سمجھتی اور ماں کے خیالات کو باپ غلط ٹھہراتا ہے۔ ماں کے لئے اس میں بڑی سہولت ہے کہ بچہ 'بیچا'، 'ہوّا' اور بھوت پریت سے ڈرے۔ باپ اسے بچہ کے حق میں زہر سمجھتا ہے۔ ماں بیمار بچہ کو دم کرانے کے لئے مسجد بھیجنا چاہتی ہے باپ اسے بیکار سمجھ کر ڈاکٹر کے ہاں لیجاتا ہے۔ ماں کی آرزو ہوتی ہے کہ بچہ کا چلہ، چھٹی، عقیقہ، سالگرہ دودھ بڑھائی، کھیر چٹائی اور بسم اللہ بڑے دھوم سے کرے، باپ اسے فضول خرچی اور بیہودگی سمجھتا ہو باپ چاہتا ہے کہ بچہ کو کسی اچھے مدرسہ کے دارالاقامہ میں شریک کرائے ماں اُسے اپنی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی۔ ماں چاہتی ہے کہ اپنے جیتے جی ننھے سے دولہا کو سہرا باندھے دیکھ لے اور چھوٹی سی بہو

بیاہ کر لائے باپ اُسے لڑکے کے حق میں سم قاتل سمجھتا ہے۔ غرض "دو ملا میں مرغی حرام"۔ اس کشمکش کی وجہ سے بیچارے بچہ کی جان عجب عذاب میں ہوتی ہے۔ وہ باپ کے کہے پر چلتا ہے تو ماں خفا ہوتی ہیں اور ماں کی بات سنتا ہے تو باپ ہڈیاں نرم کرتے ہیں۔ اس کا اثر اُس کی ذہنیت پر اسقدر تباہ کن ہوتا ہے کہ وہ عمر بھر ان متضاد اثرات کو زائل نہیں کر سکتا۔ ہماری سوسائٹی میں آج کل آپ کو بکثرت لوگ سخت متلون مزاج ملیں گے جو گھڑی میں شیطان ہوتے ہیں تو گھڑی میں فرشتہ۔ اُن پر نہ نیک کا اطلاق ہو سکتا ہے نہ بد کا۔ وہ غریب در اصل اسی دو عملی کے ثمرات اسی کشمکش کے شکار ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ مغربی تعلیم اور مغربی قوموں کے میل جول سے ہمارے خیالات ہمارا طرز بود و باش، ہمارا لباس ہماری غذائیں ہمارے مکان غرض ہمارا پورا تمدن اس قدر بدلتا جا رہا ہے کہ اس سیلاب کا رُکنا اب کسی طرح ممکن نہیں رہا۔ لیکن ہماری عورتیں اُسی پرانی تہذیب پر قائم ہیں جسکی پابند اپنی بڑی بوڑھیوں کو دیکھتی چلی آئی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ ہماری سوسائٹی کی دونوں جنسوں میں روز بروز ایک خلیج اختلاف حائل ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ موجودہ تعلیم یافتہ لڑکیاں اس پرانی ڈگر سے بتدریج ہٹتی جا رہی ہیں لیکن اُن کی تعداد اور رفتار اتنی کم ہے کہ ہر نئے قدم پر وہ مردوں سے قریب تر ہونے کے بجائے بعید تر ہوتی جا رہی ہیں اور یہ خلیج پردہ کی بدولت روز بروز وسیع ہوتی جاتی ہے۔ تعلیم یافتہ مردوں نے جب دیکھا کہ اس کی اصلاح میں طرح طرح کی دشواریاں پیش آ رہی ہیں اور خود اُنہی کے ہمقوم ان کے راستے میں روڑے اٹکا رہے ہیں تو اُنھیں اس خلیج کے عبور کرنے سے بحیرۂ عرب اور بحیرۂ روم کا عبور کرنا زیادہ آسان معلوم ہوا اور وہ اپنی شبستانوں کو نازنینان ہند سے زینت دینے کے بجائے مہوشانِ فرنگ کے رخ روشن سے منور کرنے لگے۔ اس صورت حال کا ہماری قومی اور عمرانی زندگی پر جو اثر پڑ رہا ہے اُسے آپ لوگ میرے بہ نسبت غالباً کچھ زیادہ ہی ناپسند کرتے ہوں گے لیکن ہم میں سے اکثر حضرات اس کے اسباب رفع کرنے میں جتنی کوشش کر سکتے ہیں اس سے زیادہ کوشش یقین ہے کہ وہ میرے اس مضمون کا جواب لکھنے میں صرف فرما دیں گے۔

پردہ کی بدولت سب سے بڑا نقصان مسلمانوں کو عمرانی حیثیت سے یہ پہونچا کہ شادی کے لئے فریقین کے باہمی انتخاب کا موقع جاتا رہا۔ اس خرابی کے نتائج اتنے دور رس اور مہلک ہیں کہ ان پر جتنا ماتم کیا جائے بجا ہے آپ بارہ آنہ کی ایک نکٹائی خریدتے ہیں تو کسی اور کے مذاق پر اعتماد نہیں کرتے اور خود اپنی پسند سے خریدنا چاہتے ہیں حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ وہ نکٹائی دو چار مہینے سے زیادہ نہیں چلے گی اور اگر پسند نہ آئے تو اس سے قبل بھی آپ بغیر کسی دشواری کے اُسے پھینک سکتے ہیں۔ اس کے برخلاف جو عورت ایک دفعہ آپ کی پابند ہوگئی

وہ آپ کے رسم و رواج کی رو سے عمر بھر کے لئے گلے کا ہار ہوگئی جسے آپ بغیر انتہائی دشواریوں اور بدنامیوں کے الگ نہیں کر سکتے۔ لیکن اس کے باوجود آپ بغیر اس عورت کے دیکھے بھالے کسی دوسرے کی پسند یا محض قسمت کے بھروسہ پر ہمیشہ کے لئے اپنا شریک زندگی بنا لیتے ہیں۔ بعض لوگ اس مصیبت سے بچنے کے لئے غیروں میں شادی نہیں کرتے اور محض اسی کی خاطر غیر خاندانوں کے بعض اچھے موقعوں کو چھوڑ کر اپنے خاندان کی معمولی لڑکیوں ہی پر اکتفا کر لیتے ہیں لیکن خدا اس پردہ کا بھلا کرے جہاں اُس لڑکی کے والدین کو کسی لڑکے کا ایسا رجحان معلوم ہوا کہ انھوں نے فوراً اپنی لڑکی کو اس سے چھپا دیا اور اگر نسبت پکی ہوگئی تو ایسا سخت پردہ ہوگیا کہ ایک غیر شخص اُسے دیکھ لیگا لیکن منگیتر نہیں دیکھ سکتا۔ اس طرح آپس کی شادی یا منگنی کا جو اصل مقصد تھا وہ بالکل فوت ہوگیا۔ اس کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوتا کہ لڑکا اور لڑکی ایکدوسرے کے عادات و اطوار، مذاق و طبیعت، صورت و شکل سے محض ناواقف ہوتے ہیں بلکہ بسا اوقات ایک تیسرے شخص کو بیچ میں کودپڑنے کا موقع ملتا ہے۔ آپنے اکثر ایسے واقعات سُنے ہوں گے کہ جب نسبت پکی ہونے کے بعد لڑکی اپنے منگیتر سے چھپنے لگی تو اس کے کسی اور رشتہ دار نے اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر اُس کا دل موہ لیا اور جب والدین نے فقط اپنی بات نباہنے کیلئے اُس پہلے شخص سے شادی کردی تو اس شادی کا نہایت عبرتناک انجام ہوا۔

ایسی ہی صورتیں اکثر لڑکوں کے ساتھ بھی پیش آتی ہیں۔ چونکہ ان کے لئے ان کی منگیتر ایک اسم فرضی سے زیادہ نہیں ہوتی اس لئے یہ کسی اور کی زلف گرہ گیر میں دل پھنسا بیٹھتے ہیں اور وہ غریب جوان کے نام پر دھونی رمائے بیٹھی ہوتی ہے منہ تکتی رہجاتی ہے۔ اس صدمہ سے وہ بعض دفعہ خودکشی کرلیتی ہے اور بعض دفعہ ہندوؤں کی کنواری بیواؤں کی طرح ساری عمر عالم دوشیزگی میں بسر کردیتی ہے۔ خوش قسمتی سے جہاں ایسی صورتیں پیش نہیں آتیں اور ہنسی خوشی شادی ہوجاتی ہے وہاں بھی اختلاف مزاج اور اختلاف حالات کے باعث اکثر بدمزگیاں رہتی ہیں اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ تعجب تو اس پر ہوتا ہے کہ بغیر دیکھے کی شادیاں بعض دفعہ کامیاب کیسے ثابت ہوجاتی ہیں؟

براہ کرم اس کے جواب میں آپ نہایت فخر کے ساتھ یہ نہ فرمائیے کہ "ہمارے ہاں تو اتنی شادیاں کامیاب ہوجاتی ہیں اور جو کامیاب نہیں ہوتیں وہاں بھی شاذ ہی طلاق کی نوبت آتی ہے مغربی ممالک میں تو دیکھ بھال کے شادی کرنے پر روزانہ اتنے طلاق کے مقدمات رجوع ہوتے ہیں کہ ان کے لئے خاص طلاق کی عدالتیں قائم کی گئی ہیں۔ پھر جب ایسا ہے تو بغیر دیکھے ہی شادی کیوں نہ کی جائے اور خواہ مخواہ پردہ کیوں اٹھایا جائے۔"

میرے باخبر دوست! آپ نے مشرق و مغرب کے طلاقوں کی تعداد تو نہایت احتیاط سے نوٹ کرلی ہے لیکن ان کے اسباب پر احتیاط سے غور نہیں فرمایا۔ مغرب میں طلاقوں کی تعداد اس لئے زیادہ نہیں ہے کہ وہ آپ کی طرح بغیر دیکھے بھالے شادی نہیں کرتے اور نہ آپ کے ہاں طلاقوں کی تعداد اس لئے کم ہے کہ آپ یورپ کے اندھوں کی طرح شادی کیا کرتے ہیں۔

مغربی قوموں میں دیکھ بھال کر شادی کرنے کے باوجود طلاقوں کی کثرت کے اسباب یہ ہیں کہ:۔

(۱) وہ اپنی ازدواجی زندگی میں ذراسی بھی بدمزگی کو پسند نہیں کرتے۔ اگر شادی کے بعد میاں بیوی سے وہ توقعات جو انھوں نے ایکدوسرے سے پہلے وابستہ کئے تھے پورے نہ ہوئے تو وہ فوراً تعلق منقطع کرلیتے ہیں اور اپنی زندگی کو آپ کی طرح خود اختیاری آلام و مصائب کا ایک لاانتہاہی سلسلہ نہیں بناتے۔

(۲) چونکہ وہاں ہر فریق معاشی حیثیت سے آزاد ہوتا ہے اس لئے اسے اس علحدگی سے مالی مشکلات کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا۔

(۳) چونکہ وہاں طلاق معیوب نہیں سمجھا جاتا اس لئے کسی کو سوسائٹی کی نفرت و حقارت کا خطرہ نہیں ہوتا۔

(۴) چونکہ وہاں کی عورتیں جاہل، بے وقوف اور آلۂ بیجان نہیں ہوتیں اس لئے ذراسی حق تلفی یا بے توجہی کو بھی برداشت نہیں کرسکتیں۔ — اس کے برخلاف آپ کے ملک میں بغیر دیکھے بھالے شادی کرنے کے طلاقوں کی کثرت اس لئے نہیں ہے کہ:۔

(۱) یہاں عورتیں معاشی حیثیت سے مردوں کی تابع ہیں۔ وہ اچھی طرح سمجھتی ہیں کہ اگر مرد انھیں طلاق دیدیں گے تو وہ فاقوں مرجائیں گی اور سڑکوں پر ننگی پھریں گی۔

(۲) ان کی یہ حالت دیکھ کر راہ رو ہمدردی یا مدد کرنے کے بجائے یا تو ان کا مضحکہ اُڑائیں گے یا انھیں کڑے تیوروں سے دیکھیں گے کیونکہ وہ ایسی عورتوں کو اخلاقی مجرم سمجھتے ہیں۔ — وہ اپنے ہمچشموں میں ایسی ذلیل و خوار ہوجائیں گی کہ لوگ ان کے سایہ سے بھاگیں گے۔

(۳) چونکہ ہماری عورتیں ذہنی اور تعلیمی اعتبار سے نہایت پست ہیں اس لئے انھیں ہماری بہت سی بدتمیزیاں اور بیہودگیاں محسوس تک نہیں ہوتیں اور وہ اپنی اسی جنت الحمقا (Fools' paradise) میں خوش رہتی ہیں پس اگر آپ ان کو اسی جنت میں رکھنا اور خود بھی اسی جنت میں رہنا چاہتے ہیں تو تمام کالج اور مدرسے خواہ وہ زنانہ ہوں یا مردانہ بند کرادیجئے۔ پردہ کی سختیاں اور بڑھا دیجئے۔ موجودہ ذرائع

آمد و رفت اور رسل و رسائل کا قطعاً بائیکاٹ کر دیجئے مختصر یہ کہ اس بیسویں صدی سے نکل کر تیرہویں صدی میں رجعت قہقری کیجئے ورنہ یاد رکھئے کہ جس دن مندرجہ بالا وجوہ باقی نہیں رہے اسی دن سے ان کورانہ شادیوں کی بدولت یہاں طلاقوں کی وہ کثرت ہوگی کہ مجبوراً حکومت ہند کو سارے ملک کے مکانات کرایہ پر لے کر اُنھیں طلاق کی عدالتوں میں مبدل کر دینا پڑے گا۔ آپ فرمائیں گے کہ "طلاق کے یہ سب وجوہ صرف عورتوں سے متعلق ہیں۔ اگر فی الواقع ہمارے ملک کی اکثر شادیاں کامیاب نہیں ہوتیں تو مردوں کو عورتوں کی درخواست کے بغیر طلاق دینے میں کیا امر مانع ہے؟ وہ خود ایسی عورتوں سے پیچھا کیوں نہیں چھڑا لیتے جن سے ان کی طبیعت نہیں ملتی"؟ آپ کا یہ اعتراض صحیح ہے۔ فی الحقیقت ہمارے ملک میں مردوں کو طلاق دینا اتنا مشکل نہیں جتنا عورتوں کو لینا ہے۔ لیکن اس کے باوجود مردوں کے ازخود طلاق نہ دینے کے چند وجوہ ہیں۔

(۱) پہلے تو یہ کہ ہندوستانی گھروں میں آپس کی ناموافقت کا سارا خمیازہ عورتوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ مرد کا اُس میں کچھ نقصان نہیں ہوتا۔ وہ عورت کی خلاف مرضی جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ لیکن اگر عورت اُس کی مرضی کے خلاف کوئی کام کرے تو وہ چشم و ابرو، زبان، ہاتھ بلکہ ڈنڈے اور جوتے سے بھی کام لے سکتا ہے۔ اس لئے مرد ایسی بیکس عورت کو خواہ مخواہ اپنے قبضہ سے نکالنا پسند نہیں کرتا اور یہی سمجھ کر رہنے دیتا ہے کہ چلو ایک ماما کی تنخواہ ہی بچی۔

(۲) جن مردوں کا درجۂ حرارت اس سے زیادہ ہوتا ہے اُنھیں ایک ایسی عمدہ ترکیب آگئی ہے کہ جس سے سانپ بھی مرجاتا ہے اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹتی۔ یعنی وہ عورتوں کو عالم برزخ میں چھوڑ دیتے ہیں جو عرف عام میں صرف "چھوڑ دینا" کہلاتا ہے۔ اس چھوڑ دینے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ مرد نے اُس عورت کو نہ تو طلاق دی ہے نہ اس سے کوئی واسطہ رکھا ہے۔ ایسی عورت کا اگر کوئی پرسانِ حال ہوا تو وہ اس کے سر جا پڑتی ہے ورنہ جو طریقے اس سے بن پڑتے ہیں ان کی مدد سے کچھ کما کھالیتی ہے۔ عورت اس کو غنیمت سمجھتی ہے کہ طلاق کی رسوائی سے بچی مرد اسکو غنیمت سمجھتا ہے کہ مہر کے بار سے ہلکے ہوئے۔ اس طرح ایک انبوہ کثیر اسی عالم برزخ میں زندگی بسر کر رہا ہے اور ایسی صورتیں ہمارے طلاق کی فہرست میں شامل نہیں کیجاتیں۔

(۳) تیسرا سبب مردوں کے طلاق نہ دینے کا یہ ہے کہ ایک عورت کو طلاق دینے کے بعد لوگ ایسے شخص کو اپنی بیٹی دیتے گھبراتے ہیں کہ مبادا اس کا بھی وہی حشر ہو۔ اس طرح طلاق کا جو عملی فائدہ ہونا چاہیئے وہ آسانی سے نہیں حاصل ہوتا۔ اب رہے ناجائز تعلقات سو ان کے لئے بیوی کی موجودگی کسی طرح مانع نہیں

ہو سکتی۔ پھر کیا ضرور ہے کہ طلاق دیگر پیچشوں میں الگ خفیف ہوں اور مہر کی فکر الگ کرنی پڑے۔ غرض یہ سب وجوہ ملکر ہندوستان کے طلاق کی تعداد بڑھنے نہیں دیتے۔ اس سے آپ اس مغالطہ میں مبتلا ہیں کہ ہماری ازدواجی زندگی جیسی خوشگوار ہے ویسی دنیا کی کسی اور قوم کو نصیب نہیں حالانکہ جس ملک میں دولہا دلہن کے باہمی انتخاب سے شادی ہونے کے بجائے اور لوگوں کے انتخاب سے شادی ہوتی ہو وہاں حقیقی مسرت کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔

یورپ کی خلاف نسواں تحریک

آخر میں ایک سرسری نظر اُن اسباب پر ڈالتا ہوں جنکی مدد سے مردوں نے عورتوں کو اپنا مغلوب کیا تھا اور ابتک اُن پر حکومت کرتے چلے آئے ہیں۔ اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ مرد جسمانی اعتبار سے عورت کے بہ نسبت قوی ہوتا ہے اور یہ تفوق نہ صرف انسانوں میں پایا جاتا ہے بلکہ تمام ذی روح مخلوق میں لیکن اس سے انسان کے سوا کوئی مخلوق ناجائز فائدہ نہیں اُٹھاتی مثلاً آپ نے کبھی کسی درندے یا چرند یا پرند کو اپنی مادہ سے لڑتے یا اُسے مارتے یا اس کا حصہ کھاتے نہ دیکھا ہوگا بلکہ وہ ہمیشہ اپنی ذات سے زیادہ اپنی مادہ کا خیال رکھتا ہے اور اپنے اس جسمانی تفوق سے اُسے نقصان پہونچانے کے بجائے اس کی مدد کرنے کی کوشش کرتا ہے جس کی سیکڑوں مثالیں آپ روزمرہ مختلف جانوروں میں دیکھتے ہوں گے۔ حیوانات کی دو جنسوں میں جسمانی قوت کے اختلاف کے باوجود آپ کامل مساوات پاتے ہیں اور کبھی ایک کو دوسرے کی کمزوری سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے نہیں دیکھتے۔ لیکن حضرت انسان نے جو اپنے آپ کو اشرف المخلوقات سمجھتے ہیں تمام مخلوق کے برخلاف اس جسمانی قوت کے اختلاف کی یہ تعبیر کی کہ گویا خود قدرت عورت کو مرد کا تابع رکھنا چاہتی ہے چنانچہ مردوں نے اپنی جسمانی قوت سے کام لیکر سب سے پہلے عورتوں کے معاشی حقوق غصب کیے اور اُنکے تمام ذرائع آمدنی پر قبضہ کر کے اُنھیں اپنا مطیع بنالیا۔ یہ صورت حال اُسوقت تک دنیا میں باقی رہی جب تک جسمانی قوت کا دور دورہ رہا۔ جوں جوں مشینوں کی ایجاد ہونے لگی دنیا کا رنگ بدلنا شروع ہوا اور عورت نے اپنی کھوئی ہوئی قوت از سر نو حاصل کرنی شروع کی یہاں تک کہ بعض میدانوں میں مردوں سے بھی سبقت لے گئی۔ مرد ہر چند اُس کی ان کوششوں میں مزاحم ہوتا رہا لیکن آزادی نسواں کا یہ سیلاب ایک دفعہ اپنی معاشی جکڑبند توڑنے کے بعد برابر بڑھتا گیا یہاں تک کہ بیسویں صدی میں جنگ عظیم کی بدولت یورپ کے مردوں کا رہا سہا تفوق اور عورتوں کی رہی سہی قیدیں بھی ٹوٹ گئیں اور انھوں نے کامل مساوات کا

دعوےٰ کر دیا۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ کوئی شخص اپنی چڑھی ہوئی کمان کو اُترا دیکھنا پسند نہیں کرتا اور ہر معزول حاکم چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اپنی حکومت پھر حاصل کرے۔ اس کے لئے وہ اپنی ساری قوت صرف کر دیتا ہے اور ہر جائز و ناجائز طریقہ اختیار کرتا ہے۔

آج دنیا کا سرمایہ دار مزدوروں کے روز افزوں مطالبات سے کسقدر عاجز و پریشان ہو گیا ہے اور انھیں ان کے جائز حقوق سے محروم رکھنے کے لئے کیا کچھ نہیں کر رہا ہے لیکن صرف سرمایہ دار کی یہ حیرانی و مجبوری دیکھکر کیا آپ مزدور کے ان مطالبات کو ناجائز قرار دیدیں گے؟ یہی حال تحریک مخالف نسواں کا ہے۔ مرد اپنا کھویا ہوا اقتدار پھر حاصل کرنا چاہتے ہیں عورتیں اپنا حاصل کیا ہوا اقتدار پھر کھونا نہیں چاہتیں۔ اسی کشمکش کا نام تحریک مخالف نسواں ہے پہلے تو یہ تحریک یورپ میں نہایت کمزور و محدود ہے لیکن بالفرض بڑھکر قوی اور وسیع بھی ہو جائے تو اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ یہ تحریک فی الواقع بجا اور اس کے حامی درحقیقت حق بجانب ہیں۔ دنیا میں چور اور ڈاکو اپنے بڑے بڑے جتھے بنا کر کمزوروں کا مال و متاع لوٹ لیتے ہیں اور ان کی آزادی اور زندگی خطرہ میں ڈالدیتے ہیں لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قتل و غارت نہایت مستحسن افعال اور اُن کے مرتکب نہایت مقدس لوگ ہیں۔ میں نے لوگوں کو اکثر یہ کہتے سنا ہے کہ "آج یورپ اسی آزادیِ نسواں کی بدولت سر پر ہاتھ رکھکر رو رہا ہے"۔ مگر میں نہیں سمجھ سکا کہ اس سے وہ آخر کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ یورپ کسی ایک شخص کا نام تو نہیں کہ جو کسی مجسمہ کی طرح کسی میدان میں کھڑا ایک ہاتھ سے سر کو پکڑے، اور دوسرے سے اپنے آنسو پوچھتا جاتا ہو۔ یورپ ایک براعظم ہے جہاں، دنیا کے اور مقامات کی طرح مرد بھی بستے ہیں اور عورتیں بھی۔ یہ ظاہر ہے کہ خود عورتیں اپنی اس آزادی پر جس کے لئے یہ ساری کشمکش ہے سر کو ہاتھ لگا کر نہیں رو رہی ہوں گی۔ اب رہ گئے مرد اُن میں اگر بعض آزادیِ نسواں کے خلاف ہیں تو بہت سے اس کے حامی بھی ہیں جو حامی ہیں وہ تو سر کو ہاتھ لگا کر نہیں رو رہے ہوں گے اب رہ گئے وہ جو اس کے خلاف ہیں وہ عورتوں کی آزادی سلب کرنا چاہتے ہیں مگر نہیں کر سکتے تو ایسے لوگوں کا سر کو ہاتھ لگا کر رونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ آج قیصر جرمنی۔ سلطان روم۔ شاہ افغان۔ مہاراجہ اندور سب اپنے سروں کو ہاتھ لگا کر رو رہے ہیں لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اُن کے ممالک یا نوع انسان کو بھی ان کے ساتھ رونا چاہئے۔ ہر حاکم جو اپنے محکوموں کو ناخوش رکھتا ہے اُس کا یہی انجام ہوتا ہے اور یہی انجام آپ کا ہو گا اگر آپ اپنی عورتوں کو اسی طرح دبانے کی کوشش کریں گے۔ جو اسباب یورپ میں تحریک مخالف نسواں کے ہیں وہی ہندوستان میں تحریک

پردہ کے ہیں۔ جس طرح یورپ کے بعض نااہل اور خود غرض مرد عورتوں کو اپنے دوش بدوش کام کرتا نہیں دیکھ سکتے اسی طرح ہندوستان کے جاہل اور ناعاقبت اندیش مرد پردہ اُٹھا کر اپنے ناجائز اختیارات سلب کرانا نہیں چاہتے۔ لیکن نہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے نہ یہ' اس لئے کہ خود قانون قدرت جبر و تعدی کا دشمن ہے۔ یہ جبر و تعدی خواہ کسی صورت میں اور کسی جنس پر ہو لیکن قدرت ظالموں سے انتقام لئے بغیر نہیں رہتی۔ اگر آپ نے انقلاب فرانس اور انقلاب روس کے عبرتناک واقعات سنے ہیں تو اس کے بعد غالباً آپ کو کسی تاریخی شہادت کی ضرورت نہ ہوگی۔

محمد اعظم

شہوانیات یا ترغیبات جنسی

حضرت نیاز کے قلم سے

جس میں فحاشی کی تمام فطری و غیر فطری قسموں کے حالات، اور ان کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی اور آیندہ اخلاق انسانی کی بنیاد کن اُصول پر قایم ہونا ہے۔ الغرض اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ کتاب بالکل نئی چیز ہے اور ایکبار شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے ہوئے آپ اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ اس کتاب میں ایسے ایسے حیرت انگیز واقعات درج ہیں کہ آپ نے کبھی سُنے نہ ہوں گے، اگر آپ نگار کے خریدار ہیں تو علاوہ محصول ۸ر کے مجلد کتاب صرف ۱۲ میں اور غیر مجلد ۱۰ر میں ملے گی اور اگر آپ نگار کے خریدار نہیں ہیں تو مجلد ۱۴ر میں اور غیر مجلد ۱۲ر میں علاوہ محصول ۸ر کے ملے گی۔

اگر

ارشاد ہو تو کتاب بذریعہ وی پی روانہ کی جائے حجم ۲۷۵ صفحات آرڈر میں مجلد و غیر مجلد کی صراحت ضروری ہے۔

منیجر نگار لکھنؤ

مکتوبات نیاز

میرزا صاحب۔ کہئے آجکل آپ کی "ستارہ پیشانی" کہاں ہیں۔۔ کیوں؟ کیا "زہرہ جبین" کا یہ ترجمہ بُرا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "عشق" نام ہے صرف حماقت کا، خواہ قبل مسیح ہو یا بعد مسیح۔ فرق اتنا ہے کہ اگلے وقتوں کا عاشق اکثر و بیشتر مفلس و نادار ہوتا تھا اس لئے سوائے اس کے محمل کے پیچھے پیچھے دوڑتا پھرے یا پہاڑ کے پتھر پھوڑا کرے اور کیا کر سکتا تھا، یہ زمانہ ذرا زرداری کا ہے، اس لئے اب معشوق کی جستجو میں پاؤں کے آبلے نہیں پھوٹتے، پٹرول بہایا جاتا ہے اور بجائے جوئے شیر لانے کے وہسکی اور شامپین کی طلب ہوتی ہے۔۔ رہا سوال کامیابی کا، سو پہلے محبوب ملتا تھا خدا جانے کتنا سر کھپانے کے بعد، اور اب یہ مصیبت ہے کہ وہ سب کو آسانی کے ساتھ مل جاتا ہے، الغرض محبت کی دشواریاں بدستور قائم ہیں۔۔ اس لئے میری ہمدردیاں تو آپ کے ساتھ وہی ہیں جو کسی وقت قیس و فرہاد کے چارہ سازوں کو اُن کے ساتھ رہی ہونگی، البتہ سوال یہ ہے کہ جب باوجود "اینہمہ دعوائے مرزائیت و طنطنۂ سوفسطائیت" آپ کسی کے سامنے "منھ پھاڑ سر جھاڑ" بھیں بھیں رو رہے ہوں گے، تو اس وقت مجھ غریب "چارہ گر" کی کیا حالت ہو گی۔۔ آپ ہی کہئے، سوائے دُم دبا کر فرار ہو جانے کے اور کیا ہو سکتا ہے۔

مجھے معلوم ہوا ہے کہ پھر آپ کے صبر و استقلال کی حالت بہت سقیم ہے اور شاید دو ہی چار دن میں اسکا جنازہ نکلنے والا ہے۔ اگر یہ خبر صحیح ہے (اور یقیناً صحیح ہو گی) تو کم از کم میرا "استعفاء رفاقت" تو آپ قبول ہی کر لیجئے، مجھے "غم روزگار" سے اتنی فرصت کہاں کہ آپ کے "غم عشق" کی سربراہی کرتا پھروں۔ آپ کو اُن کی محبت و وفاداری پر یقین ہے، مناسب۔۔ لیکن مجھے باور نہ کرائیے، کیونکہ اس کے بعد بھی میں عاشق ہونے سے رہا اور آپ معشوق بننے سے۔

حیرت ہے کہ ایسے گوش ہوش والے انسان بھی اس کوچہ میں آ کر اتنے احمق ہو جاتے ہیں۔

سنئیے، ایک بات ضروری عرض کرنا ہے - کل دلدار خانصاحب کا خط آیا - وہ کہتے ہیں اگر اسوقت غفلت سے کام لیا گیا تو پھر ایسا موقعہ ہاتھ نہ آئے گا - چونکہ موقعہ محل کی باتیں آپ زیادہ سمجھتے ہیں اس لئے میں نے جواب دینے سے قبل یہ مناسب سمجھا کہ آپ کی رائے اس معاملہ میں لیلوں -

یہ بالکل درست ہے کہ میں اس کام کی تکمیل کے لئے بیتاب ہوں اور یہ بھی غلط نہیں کہ خانصاحب میرے ہوا خواہ ہیں اور ایک حد تک صائب الرائے بھی، لیکن مجھے صرف یہ اندیشہ ہے کہ اگر اس کے بعد بھی کار برآری نہ ہوئی تو پھر سوائے سر پھوڑ کر مرجانے کے اور کوئی صورت باقی نہ رہیگی -

بار بار آپ کا احسان اُٹھانے میں تو چنداں حرج نہیں، لیکن یہ مسلسل مایوسیاں کس سے برداشت ہونگی - بہرحال، آپ کے جواب کا منتظر ہوں، اور جواب بھی وہ جس میں میری "خاطر داری" کا لحاظ مطلق نہ کیا جائے بلکہ صرف مصلحت و عاقبت بینی کا -

---

ارے یار، چُپ بھی رہو - اب کیوں کہتے ہو - اُن، اُن،

عرفی مگو بہ تیرہ شبِ ہجر حرفِ مے
حرفیست ایں کہ در شبِ مہتاب گفتنی ست

یہ تم نے کیا کہا، یہ میں نے کیا سنا - معاذاللہ!

باور کرو جس وقت وہ صحبت یاد آجاتی ہے تو دل تڑپ کر رہجاتا ہے - تمہارے کہنے کی ضرورت تھی، میں تو وہاں اُڑکر پہونچتا، لیکن باور کرو، بہت درماندہ ہوں "اتنا درماندہ کہ اب کیا کہوں"۔

قصۂ غم سنا کر تمھاری مسرتوں کو خراب کرنا نہیں چاہتا - بلکہ سچ تو یہ ہے کہ تمہاری کامرانیوں کی خبر سُنکر اسوقت میں اپنی ناتمرادیاں بھی بھُلائے بیٹھا ہوں -

کتنے دن قیام کا ارادہ ہے - کل چاء کے وقت میں نے شکردان کھولکر دیکھا تو شکر کے اندر ایک چیونٹا ملا خشک مرا ہوا - میں نے سوچا کہ دیکھئے، جان بھی وہیں دی اور دفن بھی وہیں ہوا - سو بھائی تمھاری خواہش تو قریب قریب یہی ہوگی لیکن میں جانتا ہوں کہ اتنی فرصت زمانہ کب دیتا ہے، بہرحال وہاں سے آنا پڑے گا اور اسی لئے پوچھا کہ کب تک اس کی توقع - (غالبًا اندیشہ، زیادہ صحیح لفظ ہوگا) کی جائے -

میرا سلام عرض کردو اور کہو کہ کیوں صاحب اِدھر سے گزر جانا اور بات تک نہ پوچھنا - بہتر ہے میں نے بھی

اگر اس غصہ میں شیشہ کا شیشہ خالی نہ کر دیا تو میرا نام مفتی صدر الدین آزردہ نہیں۔

میں اور شغل بادہ کشی، لے گئیں مجھے
یہ کم نگاہیاں تری بزم شراب میں (آزردہ)

ہنسو، ہنسو، ہاں، خوب ہنس لو۔۔ کاہے کو کبھی ایسا موقعہ ہاتھ آئے گا۔ میں بیوقوف تھا کہ وہاں جا کر یہ رسوائی اٹھائی، اور تم۔ ہاں بھئی، تمہاری فراست، و دانشمندی کا کیا کہنا، کہ یہاں کہتے کہتے زبان گھس گئی لیکن تم ٹس سے مس نہ ہوئے۔ تم لاکھ عذر کرو، لیکن بخدا یہ سارا مظلمہ تمہاری گردن پر ہے۔ نہ تم خاموش رہتے، نہ مجھ سے یہ حرکت ہوتی کہ:۔

اٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

شامت جب آتی ہے تو اکثر احباب ہی کے وساطت سے آتی ہے۔ پھر اب فرمائیے کیا ارادہ ہے۔ تم سے تو خیر انتقام لینا چنداں دشوار نہیں۔ گیا اور تمہاری تسبیح توڑ کر رکھدی، دلایل الخیرات چھپا کر گم کر دی، جانماز گھسیٹ لی اور یہ کچھ نہ سہی تو تیمم کا تودہ ہی اٹھا کر پھینک دیا۔ تمہارے رُلانے کے لئے تو اتنا ہی کافی ہے، لیکن یہ بتاؤ کہ اُس "شقی" سے کیونکر عہدہ برآ ہوں، نہ خدا کا قایل نہ رسول کا، نہ کسی پیر کا معتقد نہ ولی کا۔ نہ دل میں مروت نہ آنکھوں میں لحاظ۔ ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی ۔ یہ بتاؤ تو جانوں۔

میں نے ایک تدبیر سوچی ہے۔ تمہاری کیا رائے ہے۔ یہ بالکل یقینی ہے کہ وہ چند دن میں یہاں آئیں گے، اس لئے کیوں نہ وہ دروازہ ان کے لئے مسدود کر دیا جائے جہاں کی آستاں بوسی اُن کا دین و ایمان ہے۔

پوچھو اس کا کیا ذریعہ ہے؟

تم نے اُن میر صاحب کو دیکھا ہوگا جو تنبورہ لئے ہوئے "قاچار" کے مکان کی طرف اکثر جاتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔۔ وہ ہیں اُن کے اُستاد۔ اور مجھ سے وہ عقیدت رکھتے ہیں اس لئے کہ مجھ سے زیادہ ان کا کوئی مداح نہیں۔ نہ یہ میرا کہا ٹال سکتے ہیں نہ وہ ان کا ۔۔ اس لئے سوچتا ہوں کہ اس ذریعہ سے ایک جنگ کرادوں۔ باور کرو میں اسکا دوست ہوں، لیکن یہ تباہی منظور ہے اور وہ خانماں بربادی منظور نہیں ۔۔ وہ تو ہو گئے ہیں پاگل، اس لئے اگر ان کے طرز عمل سے خفا ہو کر بیٹھ جاؤں تو پھر کون اس کشتی کو بھنور سے نکالنے والا ہے؟ کیا تم؟ ۔ کیوں نہ ہو، ماشاء اللہ!

یاد فرمائی کا شکریہ ۔ آپ نے ..... صاحب کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، خدا کرے صحیح ہو، لیکن میری رائے اُن کے نسبت یہی ہے کہ

کم چنیں دیوانۂ ہشیار پیدا می شود

آپ اپنی فطرت کے لحاظ سے فرشتہ ہیں، اس لئے ساری دنیا کو بے گناہ جانتے ہیں، میں ایسا نہیں ہوں اس لئے سمجھتا ہوں کہ معصوم صورتوں میں کیسی کیسی قبیح سیرتیں چھپی رہتی ہیں ۔ بہرحال آپ اپنے معاملات کو مجھ سے بہتر سمجھ سکتے ہیں، آپ کی مرضی ہے جو جی میں آئے کیجئے ۔ لیکن مجھ سے رائے نہ طلب کیجئے ہیں تعمیل ارشاد پنڈت جی سے ملا، اُن کے اندازِ گفتگو سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ اس باب میں براہ راست آپ ہی سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں اور میری وساطت پسند نہیں ۔ اور یہ بھی ٹھیک ۔ آپ لینے والے وہ دینے والے، میں کون، نہ تین میں نہ تیرہ میں ۔

تمہارا خط ابھی ابھی ملا ۔ یعنی ۱۰ ستمبر ٹھیک دس بجے دن کو ۔ اور اسی وقت جواب لکھنے بیٹھ گیا ۔ باتیں مزہ کی تھیں، جی لگ گیا ۔ خیر، بزرگی وُزرگی تو میں جانتا نہیں، لیکن اتنا ضرور سمجھتا ہوں کہ میرزا مظہر اپنے ذوق کے لحاظ سے واقعی "جانِ جاناں" تھے ۔

اگر تم نے ان کے کلام کا غائر مطالعہ کیا ہے تو اس کے ماننے میں تامل نہ ہونا چاہئے کہ وہ نہایت رنگین و لطیف طبیعت رکھتے تھے اور ذوقِ شعر کے لحاظ سے تو فارسی اُردو دونوں میں ان کا جواب نہ تھا ۔

رہ گیا سوال تاباں کا، سو تذکرہ نویس کچھ کہیں لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ وہ اُن سے شدید محبت کرتے تھے ۔ تاباں کے غیر معمولی جمیل ہونے پر سب کو اتفاق ہے، رہ گئے میرزا صاحب، سو ان کا یہ ذوق خود اُن کے کلام سے ظاہر ہے ۔ ہر چند امرد پرستی کا اظہار فارسی شاعری میں ایسی معمولی بات ہے کہ اس کو سامنے رکھ کر کسی شاعر کے امرد پرست ہونے پر حکم نہیں لگایا جا سکتا، لیکن میرزا صاحب کے یہاں یہ رنگ کچھ عجیب و غریب کیفیت لئے ہوئے ہے ۔

اس قسم کے اشعار کم و بیش تمام شاعروں میں پائے جاتے ہیں، لیکن میرزا صاحب جس تکرار و لذت کے ساتھ اس جذبہ کا اظہار کرتے ہیں وہ دوسروں کے یہاں بہت کم پایا جاتا ہے ۔ چند شعر سناتا ہوں ۔

دگر چگونہ تواں کرد یادِ عشق مظہر
الہ باطل است عشق نوجوانے ہست

تم کہوگے کہ "نوجوان" مرد بھی ہو سکتا ہے اور عورت بھی، بہتر ہے ایک شعر اور سنو:-

بہ طفلاں مظہر ما بسکہ اُلفت بیشتر دارد کنوں در جائے سر ہیچ مرجع سنگہا دارد

ممکن ہے تم یہ کہو کہ طفل چھوٹے بچے کو کہتے ہیں اور اس سے امرد پرستی کو کوئی تعلق نہیں، لیکن خود میرزا صاحب نے طفل کے کیا معنے لئے ہیں، یہ بھی سُن لو:-

پیر ایں قوم نوجواں باشد عشقبازاں مرید طفلان اند

طفل سے مراد اُن کی نوجوان ہے یا نہیں؟ اب کیوں نہیں بولتے - اچھا اور لو:-

شد مُرید نوجوانے گرچہ مظہر پیر بود عاقبت از بہر تحصیل کمال جذب عشق

کہ گشتہ پیر زبید او نوجوانے چند میرسد باعث ضعف قوائے مظہر ما

دل نمی دہد بدست سپاہی پسر کسے؟ مظہر تو دشمن خودی اے خانماں خراب

بہر بیعت پیری جستم جوانے یافتم خویش را مظہر بدست دلبرے بفروختم

بعض اشعار میں تو انھوں نے اشارہ تک کر دیا ہے مثلاً:-

کہ مظہر میل با رعناں جوانے میرزا دارد من از رنگیں ادا ئیہائے اشعارش گماں دارم

اور ایک جگہ تو اس سے بھی زیادہ کُھل گئے ہیں:-

سرو رعنا ساخت عشق میرزا را جا مرا کفر دیں امروز مظہر نازہا دارد بہ من

اس کی تحقیق شاید تم نے کی ہوگی کہ وہ حیدر آباد گئے یا نہیں لیکن دکن کے سانولے سلونے لڑکوں سے انھوں نے جس دلچسپی کا اظہار کیا ہے، اس شعر سے عیاں ہے:-

دلنشیں اُفتاد نقش حیدر آبادی مرا گشتہ ام محو سواد خط سبزان دکن

یہ تو وہ اشعار ہیں جن میں کسی تاویل کی ضرورت ہی نہیں، ورنہ یوں تو جھلک نہ معلوم کتنے اشعار سے نمایاں ہے۔ ایک شعر سنو کس قیامت کا لکھ گئے ہیں:-

آہ، مظہر خم سلام کسے سر ازیں تیغ بُردن آساں نیست

میں تو مظہر کے ذوق شاعری کا پرستار ہوں اور اس سے بحث نہیں کہ وہ امرد پرست تھے یا کیا۔ کیونکہ اگر ایسا ہو بھی تو کیا گناہ ہے۔ شاید تم اس راز سے آگاہ نہیں کہ "حسنِ مجرد" کے پرستاروں کا میلان اس طرف زیادہ ہوتا ہے، گو خود میرا مشرب یہ نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے کیونکہ محبت کے باب میں ارد حانیت دحقانیت میری

سمجھ میں آتی نہیں اور کسی صوفی کی خدمت میں بیٹھ کر یہ فن سیکھنے کی کوشش کبھی کی نہیں۔ میں محبت کرتا ہوں اور گناہ سمجھ کر کرتا ہوں تاکہ اس کی لذت باقی رہے۔ عورت کے ساتھ جائز کا شرعی تعلق میرے بس کی بات نہیں

پیر و مرشد،

آپ اس محبت سے فرمائیں اور میں تعمیل نہ کروں۔ یہ آپ نے کیا کہا، میری فطرت سے آپ اچھی طرح واقف ہیں کہ :-

ہر آنکہ بندہ بخواند مرا خدائے من ست

چہ جائیکہ آپ، جن کے الطاف میرے لئے سرمایۂ حیات ہیں۔ آپ مطمئن رہئے، امکان سے بھی زیادہ اگر کوئی صورت کوشش کی ہوسکتی ہے تو وہ بھی صرف کردی جائے گی اور توقع ہے کہ ناکام نہ رہوں گا۔

کل صبح اول وقت نماز پڑھکر (نماز، اس لئے کہ آپ کو میرے خشوع و خضوع کا یقین ہو جائے) راجہ صاحب سے ملوں گا اور کہوں گا کہ سرکار یہ معاملہ میری موت و زلیست کا ہے، اس لئے اگر مجھے ہلاک کرکے دنیا کی رونق آپ واقعی تباہ و برباد کرنا چاہتے ہیں، تو خیر، بات دوسری ہے، ورنہ جس طرح ممکن ہو، بشیر کو صدر دفتر میں تبدیل کردیجئے وہ پوچھیں گے اس سے تمھاری موت و حیات کا کیا تعلق ہے، میں عرض کروں گا کہ پیر و مرشد کی تمنا یہی ہے اور ان کی کسی آرزو کا پورا نہ ہونا میرے لئے موت سے بدتر ہے" ۔۔ امید تو ہے کہ مان جائیں، لیکن اگر یہ تدبیر نہ چلی تو پھر ایک صورت اور میرے ذہن میں آئی ہے۔ آپ سے اس لئے نہیں کہنا چاہتا کہ کہیں شرعی جواز و عدم جواز کی بحث نہ چھڑ جائے اور آپ مجھے اس سے باز رکھیں۔

عزیز، کیا پوچھتے ہو کیا عالم ہے۔ موسم کو دیکھتا ہوں اور یہ شعر پڑھتا ہوں

بہارِ ہند بود برشگال ہاں، غالب

دریں خزانکدہ ہم موسمِ شرابے ہست

اُف یہ کالی کالی گھٹائیں، یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں، اور ادھر

سفالینہ جامِ من از مے تہی

کل، یوسف کا خط آیا ہے، لکھتے ہیں آرہا ہوں۔ میں تمھیں خط بھیجتا ہوں، خدا کرے تم بھی جواب میں لکھو کہ

آرہا ہوں۔ ہائے، ہائے۔ ابھی نہ یوسف پاس نہ عزیز قریب، لیکن تصور ہی سے بے قابو ہوا جاتا ہوں۔ کیا تمھیں میری اس بے بسی و بیکسی پر بھی رحم نہ آئے گا۔

تم کہوگے کہ یہاں آکر کیا کروں۔ میں جانتا ہوں کہ ایک جگہ نہ بیٹھ سکنے کا عذاب جو خدا نے تم پر مسلط کیا ہے وہ یہاں بھی ساتھ آئے گا، سو، سُن لو کہ تمھارے آنے کے بعد میں خود یہاں نہیں ٹھیروں گا۔ اور دو چار دن کیلئے یا جب تک تم کہوگے بالکل خارج البلد رہوں گا۔

سر پھوڑنے کے لئے نہ یہاں پہاڑوں کی کمی ہے اور نہ دشت نوردی کے لئے جنگلوں کا فقدان ــ چلو تمھارا انتظام تو ہو گیا رہا میں اور یوسف، سو ہم دونوں گاؤں کے کسی جھوپڑے میں رات کو جس وقت بادل گرج رہے ہونگے مینھ برس رہا ہوگا کہیں دور سے آنے والی بانسری کی آواز کو سنتے رہیں گے اور تڑپتے رہیں گے۔ مگر ظالم تو کب میرا کہا مانتا ہے۔

کبھی کودکی میں جس نے نہ سنی مری کہانی
مجھے اس سے کیا توقع بہ زمانۂ جوانی

کل ہی ابین سے واپس آیا ہوں۔ تم بہت یاد آئے۔ چندراوتی کا گانا تھا۔ لطف آگیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ مع اپنی آواز کے دل میں سمائی جارہی ہے۔ عمر ۳۰ سال سے متجاوز، لیکن جمپئی رنگت اور نقشہ کی دلآویزی ہنوز باقی ہے۔ اچھو میاں بھی تھے اور ڈاکٹر شریف الحسن بھی۔ ان کی ترکیب سنئے، ایک صاحب نے تو بھیروں بہار کی راگنی میں ان کی شاگردی اختیار کی۔ اور دوسرے نے ایمن میں ان کی صاحبزادی کی۔ یہاں انتہائی مایوسی میں بے اختیار جی چاہا کہ طبلہ اپنے سر پر دے ماروں یا سر طبلہ پر ٹیک دوں، لیکن میر منور علی صاحب مجھ سے زیادہ تیز نکلے اور طبلہ کے ساتھ سارنگی کو بھی سنگوا کر بیٹھ گئے۔ کیا کہوں یہ چار دن کس خود فراموشی کے عالم میں بسر ہوئے ہیں۔ یاران مخلص کا ایک جگہ بیٹھ جانا بھی واللہ، کتنی بڑی نعمت ہے۔

فی الحال میرا ارادہ لکھنؤ آنے کا نہیں ہے، لیکن اگر زمانہ نے فرصت دی اور مکروہات نے پیچھا چھوڑا تو نومبر کے پہلے ہفتہ میں چار دن کے لئے ضرور آؤں گا۔ تم سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے اور جب سے یہ سُنا ہے کہ تم نے وہاں اپنا گھر بسالیا ہے تو بیتابی اور بڑھ گئی ہے۔

ممتاز - یہ تم نے کیونکر جانا کہ مجھے گھر کی محبت نہیں اور گھر گیا بھاڑ میں، کیا تمھاری محبت بھی نہ ہوگی، لیکن پیارے یہ بتاؤ کہ وہاں قیام کی صورت کیا ہے۔

سعدیا حب وطن گرچہ حدیثے ست صحیح
نتواں مُرد بہ سختی کہ من آنجا زادم

خدا کرے تم زندہ رہو کہ اس پیار سے کبھی کبھی پوچھ لیتے ہو، ورنہ اب اور کون پوچھنے والا باقی رہگیا ہے۔ بہرحال آؤنگا اور وطن کی ویرانیوں پر آنسو بہانے جلد آؤں گا۔ خدا حافظ

میرے عزیز دوست۔

میرا معاملہ ان کے ساتھ کیا ہے، اب یہ نہ پوچھئے۔

نے رخصت اشکے نہ فرصت آہے
دارم برخ یار غریبانہ نگاہے

میں یونہی پُردل تھا آپ نے ہمدردی فرما کر اور غضب ڈھا دیا۔ آپ کو کیا خبر کہ کتنی بار رو رو کر سینہ ہلکا کرنے کی کوشش کرچکا ہوں، لیکن دل ہے کہ اُمنڈا چلا آرہا ہے، آپ اپنے منھ سے کیوں کہیں، مجھے خود اسکا اعتراف ہے کہ تنگ ظرف ہوں، تنگ حوصلہ ہوں، درد کی تاب نہیں، ضبط کا یارا نہیں، اور کس کس سے اس حقیقت کو دہراتا پھروں کہ

مرا صبرے کم ست و درد بسیار ست ہی نالم

آپ کی ہمدردیوں کا شکرگزار ہوں اور آپ کی چارہ سازیوں کا ممنون، لیکن کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ ایک زمانہ تھا کہ مجھے خودداری کا احساس تھا اور سعی و طلب میں بیقرار رہتا تھا، لیکن رفتہ رفتہ نہ وہ خودداری باقی رہی نہ سعی و طلب کی وہ بیقراری، یہاں تک کہ اب زندگی کا مفہوم بجز

تنہا ملول بودن و تنہا گریستن

کے اور کچھ نہیں ہے۔

محترمہ - اشعار ملے اور تمام اُن درد سامانیوں کے ساتھ جو بقول آپ کے آپ کی زندگی کا سہارا، لیکن میرے

نزدیک موت کا کفارہ ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں "موج کوثر و تسنیم" کے لئے دنیا نے کتنی بار مجھ سے مطالبہ کیا اور میں نے ہمیشہ یہ کہکر ٹالدیا کہ دیکھا جائے گا۔ میں کسی سے یہ بھی تو نہیں کہہ سکتا کہ آپ کون ہیں اور کیوں اپنے کلام کی اشاعت گوارا نہیں فرماتیں۔

آپ کا یہ شعر:۔

بانسری بج رہی تھی دور کہیں
رات کس درجہ یاد آئے ہو تم

ابتک فضائے شاعری میں گونج رہا ہے۔ اب آپ نے دوسری صدائے دردناک سے تڑپا دیا۔ معاذاللہ!

کس نے مجھ کو پکارا صحرا میں
ہائیں آئی کدھر سے یہ آواز

جنگل کے سناٹے میں کسی عاشق آوارہ کا یہ محسوس کرنا کہ کوئی اُسے پکار رہا ہے، ایسی مکمل تصویر انتہائے وحشت و اُلفت کی ہے کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں۔

دشت کو چھوڑ کے میں اسکی گلی میں پہونچا
کیا کہوں تجھ سے تو واں اور بھی ٹھیرا نہ گیا

میری ہلاکت کے لئے یہی شعر کیا کم تھا کہ آپ نے مقطع لکھکر اور قیامت کر دی:۔

ہم بھی جا پہونچے تھے یہ دیکھنے کیسی ہے نسیم
حال اُس غمزدہ کا ہم سے تو دیکھا نہ گیا

باور کیجئے کہ آپ سے ملنے اور آپ کی داستان غم سننے کے بعد بھی مجھ پر اتنا اثر نہیں ہوا، جتنا آپ کے کلام سے ہوتا ہے۔ شاید اس لئے کہ جو نگاہ آئینہ سے اچٹ کر آتی ہے وہ زیادہ قاتل ہوتی ہے۔

آپ کب تک لکھنؤ آئیں گی۔ غالباً محرم میں۔ "ہاں، نہیں" دونوں صورتوں میں آپ کا سکوت ہی مناسب ہے۔ میر الطفِ انتظار آپ کیوں غارت کریں۔

مکتوبات نیاز

رعایتی قیمت میں وہی لوگ حاصل کر سکتے ہیں جو عاپیشگی بھیجدیں گے محض نام لکھا لینا مفید نہیں ہو سکتا۔ منیجر نگار لکھنو

مصطفےٰ کمال کی زندگی کے چند دلچسپ اوراق

(بہ سلسلۂ ماہ گزشتہ)

مصطفےٰ کمال یونانیوں کے مقابلہ کی طیاریاں کر رہا تھا کہ ایک اور اندرونی خطرہ سے اسے دوچار ہونا پڑا۔ اس وقت تک سمرنا کے سامنے یونانیوں کا مقابلہ زیادہ تر غیر منظم جماعت سے کیا گیا تھا جو حملہ کرکے پہاڑوں میں چھپ جایا کرتی تھی۔ اس جماعت کا سردار ایک شخص ادہم سرکیشیا کا رہنے والا تھا۔ اس نے ایک اچھی خاصی تعداد سپاہیوں کی فراہم کرلی تھی جن کا نام اس نے "سبز فوج" رکھا تھا۔ اس نے اپنا مرکز ایک مقام کیتھیا میں قایم کیا تھا اور ایک اخبار بھی شایع کیا کرتا تھا جس میں زیادہ تر بالشیوکی خیالات ہوتے تھے۔

چونکہ اس سبز فوج نے یونانیوں کے خلاف مدافعت کرکے انگورا کو تباہ ہونے سے بچالیا تھا اس لئے ادہم کے حوصلے بہت بڑھ گئے اور حکومت انگورا سے منحرف ہوکر اس نے فرمانروایانہ احکام عمال کے نام جاری کرنے شروع کردئے بلکہ اس سے بھی زیادہ اس نے یہ کیا کہ لوگوں کو سزائیں دینے لگا، جس نے نافرمانی کی اسکو سولی پر چڑھادیا اور جس وقت حکومت انگورا نے اس سے بازپرس کی تو نہایت سرکشی کا جواب دیا۔

مصطفےٰ کمال نے یہ حالت دیکھ کر فیصلہ کرلیا کہ سب سے پہلے اس بیقاعدہ فوج کی بلا کو دور کرنا ضروری ہے اس نے ادہم کو انگورا آنے کی دعوت دی اور جب وہ آیا تو اسے سمجھایا کہ ملک کے مفاد کے لئے ضروری ہے کہ بیقاعدہ فوج کو باقاعدہ فوج کے افسران کے ماتحت کردیا جائے، لیکن اس نے صاف انکار کردیا اور آخر کار مصطفےٰ کمال نے عصمت پاشا کو حکم دیا کہ اس فتنہ کو بالکل کچل دیا جائے۔

ادھر یونانیوں نے یہ دیکھ کر کہ ترک آپس ہی میں لڑ رہے ہیں، حملہ کردیا اور آفیون پر قبضہ کرلیا لیکن عصمت نے ادہم کو شکست دیکر اس کی جماعت کو کچل دیا اور یونانیوں کو بھی پسپا کرکے پھر اسی حد تک پہونچا دیا جہاں سے انھوں نے اقدام کیا تھا۔

دوسری طرف کاظم قرہ باقر نے آرمینیا پر حملہ کرکے کارس پر قبضہ کرلیا اور بالشویکی فوجوں کے ساتھ اپنی فوج

ملا دی۔ روس اسوقت روپیہ اور آلات حرب دونوں سے ترکی کی مدد کر رہا تھا، کیونکہ انگلستان ان دونوں کا یکساں دشمن تھا۔

اتفاق سے اسی زمانہ میں یونان اندرونی سیاسی نزاعات کا شکار ہو گیا اور وینزولا مع اپنے ساتھیوں کے وہاں سے نکالا گیا۔ ادھر انگلستان، فرانس اور اطالیہ اس جنگ کا جاری رہنا مناسب نہ سمجھتے تھے اور چونکہ یونان لڑنے پر اصرار کر رہا تھا اس لئے انھوں نے اپنی غیر جانبداری کا اعلان کر کے اس جنگ کو خالص ترکی و یونانی جنگ بنا دیا تھا۔ حکومت انگورہ کے پاس فرانس خفیہ پیغامات بھیج رہا تھا کہ وہ مدد کے لئے طیار ہے، اطالیہ آلات حرب سے مدد کر رہا تھا، افغانستان و ایران کے وفد قیام اتحاد کے لئے آ چکے تھے، مصر و ہندوستان کے مسلمانوں نے چندہ جمع کر کر کے روپیہ بھیجنا شروع کر دیا تھا اور خود ترکی کے اندر بھی خانہ جنگی ختم ہو کر تمام جماعتوں میں اتحاد ہو گیا تھا اور جتنی محارب فوج تھی وہ سب مصطفےٰ کمال کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئی تھی۔ اس لئے مصطفےٰ کمال نے سوچا کہ اب انتظار کی ضرورت نہیں اور اس کو فوراً یونانیوں کے خلاف اقدام شروع کر دینا چاہئے۔ اسوقت اس کے انہماک کا یہ عالم تھا کہ خواب و خور سب ترک ہو گیا تھا اور ایک لمحہ بھی کسی اور کام میں صرف نہ کرتا تھا۔ افواج کی حالت یہ تھی کہ نہ تو ان کے پاس وردی تھی، نہ کافی سامان حرب، گاؤں کی گاڑیاں پکڑ پکڑ کر ان سے ٹرانسپورٹ کا کام لیا جاتا تھا اور کھانے پینے کا ذخیرہ بھی بالکل ناکافی تھا، اور اسمبلی بدستور اس کی مخالفت پر آمادہ تھی، یوں تو وہ سب کے سامنے اپنے جذبات کسی پر ظاہر نہ ہونے دیتا تھا لیکن بعض اوقات تنہائی میں اپنی بوٹیاں نوچنے لگتا تھا۔

بہر حال حالات جو کچھ بھی ہوتے وہ ہمت ہارنا نہیں جانتا تھا اور فوزی کے ساتھ برابر انتظام میں لگا ہوا تھا۔

ٹھیک اسی وقت جبکہ وہ انگورہ میں اسدرجہ منہمک تھا عصمت پاشا اسکی شہر کے سامنے اپنا محاذ درست کر رہا تھا یونانیوں کی فوجوں کا اجتماع بڑھتا جا رہا تھا، توپیں اور ہوائی جہاز چلے آ رہے تھے، آخر کار جولائی کے پہلے ہفتہ میں انھوں نے حملہ شروع کیا اور کیٹھیا و آفیون پر قبضہ کر کے اسکی شہر تک بڑھ گئے جو ریلوے جنکشن تھا اور تمام مغربی اناطولیہ کی کلید سمجھا جاتا تھا۔ یہ حالت دیکھ کر عصمت پاشا گھبرا گیا اور اس نے مصطفےٰ کمال کو تار دیا کہ فوراً پہونچ جائے۔ مصطفےٰ کمال تار ملتے ہی اسکی شہر کی طرف روانہ ہو گیا اور یہاں پہونچکر اس نے فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لیلی اور نقشہ دیکھ کر کہا کہ۔ یہاں جنگ کرنے سے تمام ترکی فوج ختم ہو جائے گی، اس لئے اس نے فوجوں کو ۳۰۰ کیلومیٹر پیچھے ہٹا کر دریائے سکاریا کے سامنے اپنا محاذ قایم کیا۔ یہ انتظام کر کے وہ پھر انگورہ گیا کیونکہ وہاں کی رعایا خوف کی وجہ سے بھاگی جا رہی تھی اور اسمبلی والے چیخ رہے تھے کہ یہ ساری مصیبت مصطفےٰ کمال کی

لائی ہوئی ہے ۔ اس نے پہونچ کر سب کو سمجھایا کہ ڈرنے کی ضرورت نہیں وہ یقیناً کامیاب ہوگا، لیکن ضرورت ہے کہ اس کو سپہ سالار بنا کر اختیارات کامل عطا کر دئے جائیں ۔ اول اول تو اسمبلی نے پس و پیش کیا لیکن پھر مجبوراً اس کا کہنا ماننا پڑا کیونکہ کوئی اور صورت مفر کی تھی بھی نہیں ۔

اتفاق سے اسی دوران میں، وہ گھوڑے سے گر گیا اور اس کی پسلی میں سخت چوٹ آئی، لیکن وہ برابر اپنے کام میں لگا رہا اور انگورہ کا انتظام کر کے پھر دریائے سکاریا پر پہونچ گیا ۔

---

۲۴ راگست ۲۱ء کو یونانیوں نے گولہ باری سے حملہ شروع کر دیا اور اس کے بعد دونوں فوجوں میں دست بدست لڑائی شروع ہو گئی ۔ یہ جنگ مسلسل چودہ دن تک جاری رہی اور اتنی شدت کے ساتھ کہ نہ ترک ہٹنے کا نام لیتے تھے اور نہ یونانی ۔

رات کے ۲ بجے کا وقت تھا اور مصطفےٰ کمال اپنے کیمپ میں بیتابانہ ٹہل رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور ایک افسر نے اندر آ کر کہا کہ "فوزی پاشا آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں" مصطفےٰ کمال ٹیلی فون پر گیا تو فوزی نے یہ خبر سنائی کہ "آج کا دن ہمارے ہاتھ رہا، یونانیوں کی قوت بالکل ختم ہو چکی ہے اور وہ پسپائی کی طیاریاں کر رہے ہیں یہ سنتے ہی مصطفےٰ کمال نے حکم دیا کہ "تمام رزرو فوج کو شمال کی طرف منتقل کر کے دشمن کو آسانی سے پسپائی کا موقعہ نہ دو" چنانچہ اس کے بعد بھی سات دن تک یونانیوں نے مقابلہ کیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی ہمت ٹوٹ چکی تھی اور ترکوں کے دل بڑھ گئے تھے، آخر کار یونانی بھاگے اور انھیں خندقوں میں جا کر پھر پناہ لی جہاں سے وہ بڑھے تھے ۔ مصطفےٰ کمال نے حکم دیا کہ ترکی فوج بھی خندقیں کھود کر ان کے سامنے اپنا محاذ قائم کرے اور یہ انتظام کر کے انگورہ چلا گیا ۔

انگورہ کی اس وقت یہ حالت تھی کہ ہر شخص فرطِ مسرت سے دیوانہ بنا ہوا تھا اور جدھر دیکھئے سوائے غازی مصطفےٰ کمال کے اور کوئی ذکر ہی سننے میں نہ آتا تھا ۔ لیکن مصطفےٰ کمال سے پوچھئے کہ وہ کس حال میں تھا، لوگ خوش تھے لیکن وہ بدستور افکار میں گھرا ہوا تھا، دنیا سمجھ رہی تھی کہ ترکوں کو فتح حاصل ہوئی، درانحالیکہ یہ صرف مدافعانہ حملہ تھا جو کامیاب ہوا، ورنہ اصل جنگ تو ابھی باقی تھی اور مصطفےٰ کمال سمجھتا تھا کہ جب تک یونانیوں کو ملک سے نکال کر سمندر پار نہ کر دیا جائے اس کامیابی کا کوئی اعتبار نہیں ۔

چنانچہ اس نے انگورہ آتے ہی سب سے پہلے فرانس سے خفیہ معاہدہ کرکے اپنی ۸۰ ہزار فوج جو حدودِ شام میں بیکار پڑی ہوئی تھی اس کو بلالیا اور ماسکو سے روپیہ قرض لیکر اطالیہ و امریکہ سے آلات و ذخائرِ حرب خریدنا شروع کئے اسی کے ساتھ اس نے بھرتی بھی شروع کردی اور ہر وہ ترک جو تلوار اُٹھا سکتا تھا جبراً فوج میں داخل کیا گیا۔ لیکن یہ ایک دن کا کام نہ تھا اس میں مہینوں لگ گئے اور لوگوں نے پھر بھلادیا کہ یونانی ہنوز ملک کے اندر موجود ہیں۔ اسمبلی جس نے مصطفٰے کمال کو اختیاراتِ کامل دیدئے تھے اب وہ پھر اس کے اقتدار کو سلب کرنا چاہتی تھی، انور پاشا جو بخارا کا امیر ہوگیا تھا وہ بھی ترکی واپس آنا چاہتا تھا، جمال پاشا جو افغانستان میں مشیرِ فوجی تھا وہ بھی اتحاد کے لئے ہاتھ بڑھا رہا تھا لیکن مصطفٰے کمال نے کسی ایک کی نہ سُنی رؤف اور فتحی بھی مالٹا سے رہا ہوکر پہونچ گئے تھے لیکن انھوں نے یہاں پہونچکر اور مخالفت شروع کردی۔ الغرض غریب مصطفٰے کمال ان مصائب میں گھرے ہونے کے باوجود عزم کرچکا تھا کہ یونانیوں کو نکال کر رہیگا اور اسوقت سوائے اس فکر کے کوئی اور مسئلہ اس کے سامنے نہ تھا۔

آخر کار انھیں حالات میں سنہ ۲۱ء کا موسم سرما ختم ہوکر سنہ ۲۲ء کا موسم بہار آگیا اور گرمی شروع ہوگئی۔ وہ اپنے دل میں طے کرچکا تھا کہ ۲۶ اگست کو جارحانہ حملہ شروع کردیگا، لیکن کسی کو اس کی اطلاع نہیں کی اور اگست کے پہلے ہفتہ میں محاذ پر پہونچ کر فوزی اور عصمت سے ملنے کے بعد جب ہر ہر چیز کا معائنہ کرلیا تو اسنے فٹ بال کے میچ میں تمام افسران کو شریک کرکے کھیل ہی کھیل میں تمام ہدایات سمجھادیں۔

حملہ سے ایک ہفتہ قبل مصطفٰے کمال نے تمام تاروں کو قطع کرکے ترکی اور بیرونی دنیا کا سلسلہ خبر رسانی بالکل مسدود کردیا اور ۲۴ کی رات کو اس نے بڑے پیمانہ پر جلسۂ رقص منعقد کیا اور اس نے سنتریوں کو حکم دیدیا کہ کوئی شخص اس کے مکان میں نہ آنے پائے کیونکہ وہ بہت مصروف ہے۔

اس وقت تک کچھ ترکی دستے آفیون کے سامنے جمع ہوگئے تھے اور کچھ دستوں کو اس طرح نقل و حرکت دیگئی کہ یونانیوں کو شمال کی طرف متوجہ ہوجانا پڑا۔ جلسۂ رقص جاری تھا، لہو لعب میں لوگ مصروف تھے کہ رات کو ٹھیک جسوقت سوئی بارہ پر پہونچی ہے، مصطفٰے کمال نے دفعتہً حملہ کردیا اور ۲۶ اگست ۴ بجے صبح تک ترک ڈوملوپونار تک پہونچ گئے جو یونانی مدافعت کا خاص مقام تھا اور شام تک یونانیوں کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ ہر چند ترکی سپاہ اس قابل نہ تھی کہ وہ یونانیوں کا تعاقب کرتی، لیکن مصطفٰے کمال نے اس رسم کو بھی پورا کیا اور برابر دس دن تک لگاتار ان کا پیچھا کرکے اس وقت تک دم نہیں لیا جب تک سرزمین اناطولیہ یونانیوں سے صاف نہیں ہوگئی۔

ہر چند مصطفیٰ کمال یونانیوں کو ترکی ایشیا کے حدود سے باہر کر چکا تھا، لیکن چونکہ یونانی اب سمندر سے قسطنطنیہ پر حملہ کی طیاریاں کر رہے تھے، اس لئے مصطفیٰ کمال کی مصروفیت و پریشانی بدستور باقی تھی۔ فوج کی دوبارہ تنظیم کر کے قسطنطنیہ کی طرف روانہ کرنا، یونانی جس حصۂ ملک کو تباہ و برباد کر کے چلے گئے تھے اس کی دیکھ بھال، دول خارجہ کی سیاسی چالوں سے نبٹنا، الغرض یہ اور اسی طرح کی بیسیوں گتھیاں اس کے سامنے تھیں جن کا سلجھانا ضروری تھا اس کی یہ حالت تھی کہ شب و روز میں شاید دو گھنٹے آرام کرتا ہو، ورنہ ہر وقت کام میں لگا رہتا اور اپنے تن بدن کا بھی ہوش نہ تھا۔

اس انہماک و مصروفیت میں اس کے دو دن بسر ہو چکے تھے کہ تیسرے روز صبح کو اردلی نے اطلاع دی کہ کوئی خاتون ملنا چاہتی ہیں۔ مصطفیٰ کمال ہنوز کوئی جواب بھی نہ دینے پایا تھا کہ وہ خود اندر آ گئی اور یہ کہکر کہ میرا نام لطیفہ خانم ہے، خاموش کھڑی ہو گئی۔ وہ جوان تھی، بے نقاب تھی اور مغربی ملبوس سے آراستہ۔ مصطفیٰ کمال ایک منٹ تک اسے دیکھتا رہا اور پھر بیٹھنے کی اجازت دیکر انتظار کرنے لگا کہ وہ کیا کہتی ہے۔ اس نے کہا کہ "میں سمرنا کے ایک مشہور تاجر کی لڑکی ہوں اور ابھی ابھی اپنے والدین کو پیرس چھوڑ کر یہاں آئی ہوں۔ سمرنا کے پشت کی پہاڑی پر وسیع مکان ہے اور میں چاہتی ہوں کہ آپ مع اپنے اسٹاف کے چند دن میری مہمانی قبول کریں"۔

مصطفیٰ کمال کا ذوق عورتوں کے باب میں ہر چند نہایت ادنیٰ درجہ کا ہے، اور ضرورت کے وقت وہ معمولی ہوٹلوں اور بازاروں کی عورتوں سے عارضی دلچسپی پیدا کر لیا کرتا تھا، لیکن اس دوران میں وہ اپنے اس ذوق سے بھی کچھ تھک سا گیا تھا اور اسی لئے جب ایک بلند درجہ کی شائستہ و مہذب خاتون اس کے سامنے آئی تو وہ عورت کے باب میں اپنی فطری کمزوری کی وجہ سے فوراً اس کی طرف مائل ہو گیا اور اس کی دعوت کو قبول کر لیا۔

اس نئے مکان میں پہنچکر اسے بہت آرام ملا۔ جگہ وسیع و کشادہ، ملازم شائستہ و مہذب، فرنیچر نفیس و قیمتی اور پھر ایک حسین و جوان خاتون کی ہر وقت کی معیت! اس کے تمام وہ جذبات جو گزشتہ جنگ کی صعوبتوں میں گم ہو چکے تھے، پھر عود کر آئے اور اس کو یہ دیکھ کر غیر معمولی مسرت حاصل ہوئی کہ لطیفہ خانم بھی ان جذبات کی پذیرائی کے لئے آمادہ ہے۔ الغرض یہ ملاقات آہستہ آہستہ بے تکلفی کی صورت اختیار کرنے لگی اور مصطفیٰ کمال نے آخر ایک دن اظہار تمنا کر ہی دیا۔

مصطفیٰ کمال کے گزشتہ تجربات اور نیز اس کی فطری وحشت نے کبھی عورت کو اس سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی کہ وہ ایک عارضی لطف و لذت کی چیز ہے، چنانچہ لطیفہ کے متعلق بھی اس نے یہی خیال قائم کیا اور چاہا

کہ دوسری معمولی عورتوں کی طرح اس کی عصمت کا بھی سودا کرے، لیکن یہ ارادہ دیکھ کر وہ فوراً اس کی آغوش سے علٰحدہ ہوگئی، اور بولی کہ "بیشک مجھے بھی محبت ہے، لیکن جب تک عقد نہ ہوجائے میں آپ کے لئے بالکل غیر ہوں"

مصطفےٰ کمال کی زندگی میں یہ بالکل پہلا موقعہ تھا کہ اس نے ایک عورت کی طرف سے یہ جواب سنا ہو، وہ چیں بر جبیں ہوکر بولا "عقد؟ عقد کیا چیز ہے، کیا ایک کثیف داڑھی والے مُلا کا چند بے معنی الفاظ دہرا دینا اتنی اہم چیز ہے۔ علاوہ اس کے میں نے قسم کھائی ہے کہ جب تک میں ترکی کو آزاد نہ دیکھ لوں، شادی نہ کروں گا۔

لطیفہ نے بھی انھیں سخت تیوروں سے جواب دیا کہ "میں نے بھی قسم کھائی ہے، جب تک شادی نہ ہوجائیگی میں اپنے آپ کو کسی کے حوالہ نہ کروں گی، اس لئے اگر آپ کو اپنی قسم کا احترام ہے، تو مجھے بھی اپنے عہد کی پاسداری کا اتنا ہی حق حاصل ہے"۔

صبح کو مصطفےٰ کمال کا کمرہ خالی تھا اور وہ پھر اپنی افواج کے ساتھ جا کر مل گیا تھا۔

ہفتوں گزر گئے لیکن اس نے کوئی اطلاع نہیں بھیجی۔ لطیفہ منتظر تھی اور بے چین بھی کیونکہ وہ حقیقتاً اسی سے محبت کرتی تھی کبھی وہ سوچنے لگتی کہ کیا واقعی اس نے غلطی کی۔ لیکن بعد کو وہ پھر مطمئن ہوجاتی، یہاں تک کہ جب زمانہ کافی گزر گیا تو مایوس ہوکر وہ پھر اپنے مطالعہ کی دلچسپیوں میں مصروف ہوگئی اور اُن خانماں برباد ترکوں کی اعانت و ہمدردی میں اپنا وقت صرف کرنے لگی جو ہزاروں کی تعداد میں سمرنا سے چلے آرہے تھے۔

اِدھر مصطفےٰ کمال بھی اپنے کاموں میں مصروف تھا۔ کبھی بروصہ جاتا کبھی انگورا اور ایک نہایت ہی اہم مسئلہ اس کے سامنے تھا۔ وہ مضطرب تھا کہ یونانیوں کو کسی طرح ترکی کے حدود سے باہر نکال کر ایتھنس تک پہونچا دے قبل اس کے کہ وہ اپنی فوج کی دوبارہ تنظیم کرسکیں، لیکن دشواری یہ تھی کہ اس کے پاس کوئی جہاز نہ تھا اور لامحالہ خشکی کے راستہ سے اس کو درۂ دانیال عبور کرنا تھا، جہاں چناق پر انگریزی فوج پڑی ہوئی تھی جو اسے یوروپ کے حدود میں جانے سے روکتی تھی۔ کچھ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ انگورا واپس آکر اس نے ان تمام مسائل پر غور کرنا شروع کیا اور تمام امکانات کو سامنے رکھکر سوچنے لگا کہ اس گتھی کو کیونکر سلجھائے۔ اگر سوال صرف یونانیوں کا ہوتا تو اسے چنداں پرواہ نہ ہوتی، لیکن وہاں تو درمیان میں مصیبت انگریزی فوجوں کی تھی جن سے مقابلہ کرنا آسان نہ تھا۔

اس کی فوج تھکی ہوئی شکستہ حال تھی اور سامان حرب بھی کافی نہ تھا، علاوہ اس کے نہ اس کے پاس

توپیں تھیں نہ جدید آلات حرب۔ برخلاف اس کے انگریزی فوج کی یہ حالت تھی کہ وہ ہر طرح آراستہ تھی، آسودہ تھی، ذخیرۂ حرب بھی اس کے پاس کافی تھا، بڑی بڑی توپیں، بڑے بڑے ہوائی جہاز اس کی مدد کو موجود تھے اور پھر اگر ضرورت ہو تو بیڑہ کا بیڑہ مدد کے لئے طیار، اور بات بڑھ جائے تو اس سے بھی زیادہ پوری سلطنت کی قوت موجود۔ اس لئے وہ سوچتا تھا کہ اگر واقعی انگریز لڑائی پر آمادہ ہو گئے تو پھر کوئی امکان کامیابی کا نہیں ہے۔ لیکن غور طلب مسئلہ یہی تھا کہ آیا واقعی یہ جنگ کے لئے آمادہ ہیں یا محض دھمکی دینا مقصود ہے۔

فرانس و اطالیہ والے کہہ رہے تھے کہ یہ صرف برطانیہ کی چال ہے اور لڑنا مقصود نہیں، یہی رائے روسیوں کی تھی لیکن ان کی رائے پر مصطفیٰ کمال عمل کرنا مناسب نہ سمجھتا تھا کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کا دوست ان میں سے کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ خود غور کر رہا تھا کہ صورتِ حال کیا ہے۔ اخبارات سے اس کو اتنا تو ضرور معلوم تھا کہ انگریز قوم جنگ کے خلاف ہے اور لائڈ جارج کی محاربانہ پالیسی کو پسند نہیں کرتی لیکن اسکے سامنے سب سے اہم یہ سوال تھا کہ وہ سر چارلس ہرنگٹن کے تیوروں کو معلوم کرے جو اسوقت قسطنطنیہ میں اتحادی افواج کا کمانڈر تھا۔ مصطفیٰ کمال یہ تو جانتا تھا کہ اگر جنگ شروع ہو گئی تو فرانسیسی اور اطالوی افواج علحدہ ہو جائینگی، لیکن خود انگریزی فوجیں کیا کم تھیں کہ ان کا مقابلہ آسان ہو گا۔ اس دوران میں اس نے اُس خفیہ مراسلت کی بھی خبر رکھی جو تار کے ذریعہ سے مابین قسطنطنیہ اور لندن ہو رہی تھی، اسی کے ساتھ اس نے دیگر ذرائع سے یہ بھی معلوم کیا کہ ہرنگٹن کس پالیسی کا آدمی ہے اور آخر کار وہ حد درجہ کشمکش کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا کہ یہ وقت بازی لگانے کا ہے، یا تو ترکی ہمیشہ کے لئے آزاد ہوتا ہے یا پھر صفحۂ ہستی سے اس کا نام مٹتا ہے۔ مصطفیٰ کمال نے اپنی آستین اُلٹ لی اور حکم دیا کہ دو ہزار ترک سواروں کی جمعیت انگریزی افواج کی طرف پیشقدمی کرے۔

چنانچہ آہستہ آہستہ کمالی فوج بڑھی اور جب وہ انگریزی حدود میں پہونچی تو مضبوطی سے روک دی گئی — مصطفےٰ کمال نے دیکھا کہ اب پانسہ ڈالنے کا وقت آگیا ہے، اس نے حکم دیا کہ پیدل فوج کا ایک دستہ آگے بڑھے لیکن بندوقوں کا منھ نیچے کی طرف کر کے تاکہ انھیں معلوم ہو جائے کہ ترک افواج کا مقصد جنگ کرنا نہیں بلکہ دوستانہ طور پر آگے بڑھنے کا ہے۔ یہ وقت حد درجہ خطرہ کا تھا۔ دونوں طرف کی فوجوں کے تیور بگڑے ہوئے تھے اور اگر غلطی سے کوئی ایک بندوق بھی کسی طرف سے چل جاتی یا کوئی پرجوش سارجنٹ ذرا سی بھی چوک حکم دینے میں کر دیتا تو پھر آگ ہی لگ جاتی اور برطانیہ و ترکی کی جنگ کا چھڑ جانا یقینی تھا۔ ترکوں کا پیدل دستہ آگے بڑھتا جا رہا تھا اور انگریزی سپاہ جو خندقوں میں پڑی ہوئی تھی حیران تھی کہ کیا کرے کیونکہ اس کو حکم صرف

یہ تھا کہ وہ ترکوں کو آگے بڑھنے سے روکے، فیر کرنے یا کوئی دوسری قوت استعمال کرنے کا حکم نہ تھا۔ آخر کار جب خندقوں کے خار دار تاروں تک ترکی دستہ پہونچا تو فوراً حکم آیا کہ وہ آگے بڑھنے سے رُک جائے کیونکہ التوائے جنگ کی گفتگو شروع ہو گئی ہے۔

دول یوروپ میں اس وقت سب سے زیادہ اضطراب فرانس کو تھا، وہ سمجھتا تھا کہ اگر لڑائی دوبارہ چھڑ گئی تو پہلے سے زیادہ خطرناک ہوگی اور اب بالشیوک حکومت ترکی کا ساتھ دیگی، چنانچہ فرانسیسی نمایندہ فرینکلن بوئلان مصطفیٰ کمال کے پاس آیا اور کہا کہ فوجی اقدام روک دیا جائے اور وہ تمام اتحادیوں کی طرف سے وعدہ کرتا ہے کہ یونانی فوجیں تھریس کے باہر کردیجائیں گی اور یوروبین ٹرکی، ترکوں کو واپس مل جائے گی اور اگر مصطفیٰ کمال کوئی اور شرط کرنا چاہے تو وہ بھی پوری کردی جائے گی لیکن جنگ کے شعلہ کو دوبارہ بھڑکانا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔

مصطفیٰ کمال یہ سنکر دل میں بہت خوش ہوا، لیکن بظاہر پس وپیش کرتے ہوئے اس نے اپنی رضامندی کا اظہار کرکے فوج کو آگے بڑھنے سے روک دیا اور عصمت پاشا کو حکم دیا کہ وہ ہرنگٹن سے موضع مدانیا میں جاکر ملے اور جزئیات طے کرے۔ چنانچہ عصمت پاشا وہاں گیا اور گفتگو کا نتیجہ یہ نکلا کہ اتحادی افواج نہ صرف یہ کہ یونانیوں کو تھریس سے باہر کردینگی بلکہ خود بھی قسطنطنیہ کو جلد سے جلد خالی کردیں گی۔

یہ تھی سب سے پہلی حقیقی فتح مصطفیٰ کمال کی سیاسی ہوشمندی کی، جس نے دفعتہً ہوا کا رُخ بدلدیا اور وہی ترک جو صلح کے اس طرح آرزومند تھے گویا بھیک طلب کر رہے ہیں، اب شرائط صلح خود لکھوا رہے تھے اور دول یوروپ اُن کے ماننے پر مجبور تھے۔

ٹھیک یہی وقت تھا کہ مصطفیٰ کمال کو لطیفہ کا خیال آیا اور دفعتہً اتنا قوی ہو گیا کہ فوراً موٹر منگا کر دیوانہ وار سمرنا پہونچا اور لطیفہ سے کہا کہ "میں شادی کے لئے طیار ہوں، ابھی، اسی وقت، بغیر کسی رسم کے" اور دوسرے دن صبح کو عقد کے بعد اسے اپنے ساتھ لے گیا۔

اس وقت مصطفیٰ کمال عظمت وجلال، کامیابی وفتحمندی کی اس بلند چوٹی پر کھڑا ہوا تھا جہاں پہونچکر انسان کا دماغ خراب ہو جاتا ہے، لیکن اس پر کوئی اثر نہ تھا ــــ اب حالت یہ تھی کہ چونکہ بازی ترکوں کے ہاتھ رہی تھی اسلئے دول یوروپ صلح کے لئے بیتاب تھے خواہ کوئی قیمت اسکی ادا کرنا پڑے لیکن مصطفیٰ کمال بچہ نہ تھا کہ وہ اس پر

بھول جاتا اس نے حد سے ایک قدم آگے نہ بڑھایا اور کہدیا کہ ترکی کی کوئی شرط سوائے اس کے نہیں ہے کہ وہ اپنے ملک کی بالکل آزاد حکومت تسلیم کی جائے اور غیر حکومتوں کو مطلق دخل دینے کا اختیار حاصل نہ ہو۔ اگر کوئی دوسرا شخص اس کی جگہ ہوتا تو معلوم نہیں کیا کیا شرائط پیش کرتا کیونکہ اس وقت تمام دنیا میں اس کی شجاعت کا غلغلہ بلند تھا ایران، افغانستان، مصر، ہندوستان وچین کے مسلمانوں کی طرف سے مبارکباد کے تار پر تار چلے آرہے تھے، ایران و افغانستان اتحاد کے لئے ہاتھ بڑھا رہے تھے اور تمام اسلامی دنیا اس "بطل اعظم" پر اپنی ہمدردیاں نثار کرنے کے لئے طیار تھی، لیکن مصطفیٰ کمال سمجھتا تھا کہ یہ تمام باتیں بیکار ہیں اور اسے معلوم تھا کہ ترکی کیا کر سکتا ہے اور کیا نہیں۔ وہ جانتا تھا کہ سلطنت عثمانیہ اب تباہ ہو چکی ہے اور کوئی قوت اسے دوبارہ زندہ نہیں کر سکتی، اس لئے اب سوال غیر ملکی مقبوضات دفتوحات کا نہیں تھا، بلکہ صرف ترکی قوم کے بقا و حیات کا تھا اور اس نے اسی پر قناعت کرنا مناسب جانا۔ اس نے دنیائے اسلامی کے تمام پیغامات کا جواب ان الفاظ میں دیا کہ "میں اپنے تمام مسلمان بھائیوں کو آزاد دیکھنے کی تمنا رکھتا ہوں، لیکن سوائے اس خواہش کے میں اور کوئی مدد ان کی نہیں کر سکتا"

اس نے اسمبلی میں صاف صاف کہدیا کہ "میں عالم اسلامی کے تمام قواعد کے اتحاد کا قایل نہیں ہوں ہر قوم کے سامنے اس کی اپنی ضروریات ہیں اور انھیں کو سامنے رکھ کر اسے اپنا لائحۂ عمل مرتب کرنا چاہئے، یہ وقت مذہبی اخوت وہمدردی کا نہیں ہے بلکہ صرف قومی تحفظ کا ہے اور اب ترکی دوبارہ وہ حماقت نہیں کر سکتا جس میں صدیوں تک مبتلا رہکر اس نے عظیم نقصانات برداشت کئے"

ان تمام کامیابیوں کے باوجود مصطفیٰ کمال کو اطمینان نہ تھا کیونکہ خود اندرون ملک اس کے بہت سے دشمن موجود تھے اور اب ان کی مخالفت کا مقابلہ کرنا تھا۔ اسمبلی نے دوبارہ اس کو انگورہ طلب کیا تا کہ صلح کانفرنس کے متعلق گفتگو کی جائے، لیکن وہ نہیں گیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس سے مقصود کچھ اور تھا۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں تھا کہ ممبران اسمبلی نے صرف جنگ کا خطرہ دیکھ کر اس کو عارضی اختیارات فوج پر دیدئے تھے لیکن اب کہ خطرہ نکل گیا ہے وہ کبھی اس کو برسر اقتدار نہ رہنے دیں گے۔ چنانچہ ایک دن دوران گفتگو میں خالدہ ادیب خانم نے اس سے کہا کہ "پاشا، اب صلح کے بعد، تم کو تھوڑا سا آرام لینا چاہئے" مصطفیٰ کمال نے کہا "آرام؟ آرام کیسا؟ اب صلح کے بعد ہم کو آپس میں بھی تو ایک دوسرے سے لڑنا ہے۔ کیا میں اُن کو چھوڑ دوں گا جنھوں نے میری مخالفت کی ہے، اور کیا وہ یوں آسانی سے میری قیادت کو تسلیم کر لیں گے"

اس نے انگورہ کہلا بھیجا کہ " میں ابھی نہیں آسکتا، میرے فوجی فرائض فی الحال سمرنا میں قیام کرنے پر مجبور کر رہے ہیں "۔ رؤف پاشا (وزیر اعظم) اور بہت سے دوسرے سیاسی حضرات اس کے پاس آئے اور پوچھا کہ " آیندہ نظام حکومت کی کیا صورت ہوگی۔ انگورہ میں تو خیر صوبجاتی خود مختار حکومت موجود ہے، لیکن قسطنطنیہ میں خلیفہ و سلطان معہ اپنے وزراء کے حکمراں ہے اس لئے اب بہتر صورت یہی ہے کہ دونوں حکومتوں کو ملا کر سلطان کو ایک آئینی حکومت کا بادشاہ تسلیم کیا جلئے اور تم وزارت کا بار اپنے سر لو "۔

مصطفےٰ کمال یہ سُنکر خاموش رہگیا، کیونکہ اس کے خیالات تو کچھ اور ہی تھے وہ منتظر تھا کہ قسطنطنیہ سے اتحادی افواج ہٹیں اور وہ خلافت و سلطانی دونوں کا خاتمہ کرکے جمہوریت کا اعلان کرے، لیکن اس کا اظہار کسی طرح مناسب نہ تھا کیونکہ ترک قوم بہت مذہبی اور قدامت پرست تھی۔ فوج ہر چند اس کے قابو میں تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ سلطان یا خلیفہ کے مقابلہ میں اسکی تلوار اُٹھنا بہت دشوار ہے۔ رؤف پاشا چونکہ اس کی طرف سے مشتبہ تھا اس لئے وہ بار بار اصرار کرتا تھا لیکن مصطفےٰ کمال نے اس سے کہدیا کہ تم انگورہ چلو میں وہیں پہونچکر مفصل گفتگو کروں گا۔

انگورہ میں اس وقت رفعت بھی موجود تھا اور علی فواد بھی ماسکو سے واپس آگیا تھا، اب رؤف بھی پہونچ گیا اور مصطفےٰ کمال بھی۔

رؤف اور رفعت، مصطفےٰ کے انقلابی خیالات سے آگاہ تھے، لیکن یہ اس وقت کی بات تھی جب اُسے کوئی عروج حاصل نہ ہوا تھا، کوئی قوت اس کے پاس نہ تھی لیکن اب حالات مختلف تھے اور وہ ڈر رہے تھے کہ دیکھئے کیا نتیجہ ہوتا ہے چنانچہ رفعت نے اس سے دریافت کیا کہ " بعض لوگ کہتے ہیں کہ تمھارا ارادہ خلافت و سلطنت ختم کردینے کا ہے، کیا یہ صحیح ہے "۔ مصطفےٰ کمال نے جواب دیا کہ " تمہاری رائے اس باب میں کیا ہے، کیا یہ مناسب ہوگا؟ " رؤف نے کہا " میرے باپ دادا نے سلاطین عثمانیہ کا نمک کھایا ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ میری رائے کیا ہوسکتی ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ وحید الدین کو تخت سے اُتار دینا چاہئے کیونکہ اس نے بڑی غداری کی ہے اور اسکی جگہ کسی اور کو سلطان بنا دینا چاہئے، یہ رائے نہ صرف میری بلکہ ساری قوم کی ہے "۔ رفعت نے بھی ہاں میں ہاں ملائی اور مصطفےٰ کمال نے یہ دیکھکر کہ ابھی وقت نہیں آیا یہ کہکر ٹال دیا کہ " میں اسمبلی میں اپنے خیالات کا اظہار کروں گا "

اس کے ایک ہفتہ بعد حکومت برطانیہ نے خلیفہ وحید الدین کو لکھا کہ لوزان کانفرنس میں صلح کی گفتگو کے لئے ترکی نمایندے روانہ کئے جائیں اور انگورہ کی قومی اسمبلی کو بھی اطلاع دیجائے کہ وہ اپنے نمایندے بھیجے۔

اس کا اثر تمام ملک میں بجلی کی طرح دوڑ گیا، کیونکہ سوائے چند آدمیوں کے سب لوگ وحید الدین کے مخالف تھے اور جانتے تھے کہ لائڈ جارج اور وحید الدین دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ خود قسطنطنیہ میں سلطان کے خلاف اتنی برہمی پھیل گئی کہ وزراء کا باہر نکلنا خطرہ سے خالی نہ تھا۔ ادہر انگورہ میں تو خیر مخالفت ہونا ہی تھی۔ مصطفےٰ کمال نے دیکھا کہ یہ موقع ہے کم از کم شخصی سلطنت کا تو خاتمہ کر ہی دیا جائے اگر خلافت کا استیصال ممکن نہیں۔ چنانچہ جس وقت انگورہ اسمبلی میں یہ مسئلہ چھڑا ہوا تھا اور ہر طرف سے پرجوش مباحثہ ہو رہا تھا کہ مصطفےٰ کمال کھڑا ہوا اور کہا کہ میرے نزدیک خلافت کو سلطنت سے علحدہ کرکے وحید الدین کے ساتھ ہی ملوکیت کو بھی مٹا دینا چاہئے"۔

یہ سنتے ہی لوگوں کے کان کھڑے ہوئے اور انھوں نے چہ میگوئیاں شروع کیں، لیکن مصطفےٰ کمال اس موقعہ کو ہاتھ سے دینا نہ چاہتا تھا، اس نے اپنے ۸۰ ساتھیوں کی مدد سے فوراً اسی جگہ ووٹ لینے کی تجویز پیش کر دی لیکن اسمبلی نے معاملہ کو خاص شرعی کمیٹی کے سپرد کر دیا۔ دوسرے دن یہ شرعی کمیٹی بیٹھی جو علماء و فقہا پر مشتمل تھی اور جس کا صدر ایک بہت ہی پرانا، دقیانوسی قسم کا مولوی قرار دیا گیا تھا۔ ان علماء میں سے ایک ایک کھڑا ہوتا اور قرآن و احادیث کے استناد اور علماء قدیم کے اقوال سے استشہاد کرتا، کوئی لفظی بحث میں پڑ کر اصل مسئلہ کو چھوڑ دیتا، کوئی منطقی و نحوی جھگڑے سامنے لا کر تنقید کرتا، الغرض یہی تو تو میں میں ہو رہی تھی کہ مصطفےٰ کمال ایک بار پھر کھڑا ہو گیا اور کہا کہ "میں یہ قال اقول کی فضول بحث سننے کے لئے طیار نہیں، سلطنت عثمانیہ ملک و قوم کے اختیارات چھین کر قائم کی گئی تھی اور اب قوم سلطان کے اختیار چھین کر اسے معزول کر دینا چاہتی ہے، اس لئے تم لوگ مانو یا نہ مانو، یہ تو ہو کر رہنا ہے، البتہ یہ ضرور ہو گا کہ تم میں سے دو چار کے سر مجھے کاٹنا پڑیں گے"۔

ظاہر ہے کہ مولوی اس کی تاب کیا لا سکتے تھے۔ بدحواس ہو کر اپنی عبائیں سنبھالتے ہوئے وہاں سے بھاگے اور بھاگتے ہوئے یہ تجویز پاس کر گئے کہ خلافت سلطنت سے علحدہ کر دی جائے اور وحید الدین کو معزول۔

اس کے بعد اسمبلی کے اجلاس میں یہ مسئلہ پھر پیش ہوا، اور مصطفےٰ کمال نے یہ دیکھ کر اس کے مخالف زیادہ ہیں ہنگامہ کے ساتھ ووٹ لینا مناسب سمجھا، اس نے اپنے گرد اپنے آدمیوں کو جمع کر کے حکم دیا کہ علحدہ علحدہ ووٹ شماری کی ضرورت نہیں یونہی مجمع سے رائے دریافت کر لی جائے، بعض نے اسکی مخالفت کی، لیکن یہ دیکھ کر کہ مصطفےٰ کمال کے تیور بگڑے ہوئے ہیں اور اس کے مسلح آدمی خدا جانے کیا کریں، اس پر راضی ہو گئے اور آخر کار اسمبلی کو اعلان کرنا پڑا کہ "ترکی سے ملوکیت و سلطانی منسوخ کی جاتی ہے"۔

اس کے پانچ دن بعد ہی رفعت قسطنطنیہ پہونچا اور قسطنطنیہ پر قبضہ کر کے سلطان کی معزولی اور دور سلطانی کے اختتام کا

اعلان کر دیا اور وحید الدین کو انگریزی جہاز میں پناہ لیکر وہاں سے بھاگنا پڑا۔ اس کے بعد اس کا بھتیجہ عبدالمجید خلیفہ بنایا گیا لیکن اختیارات حکومت اس کو بالکل حاصل نہ تھے۔

اس میں شک نہیں کہ مصطفےٰ کمال اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا لیکن وہ خوب جانتا تھا کہ اسمبلی اس کے خلاف ہے اور اصل مقصد کی تکمیل آسان نہیں۔ چونکہ شخصی حکومت منسوخ ہو چکی تھی اس لئے جدید حکومت کی تعیین ضروری تھی اور اسے معلوم تھا کہ لوگ اس کو عاملانہ خود مختاری دینے کے لئے آمادہ نہ ہوں گے۔ ہر چند فوج اس کی طرفدار تھی اور چند احباب بھی ایسے تھے جو ہر موقعہ پر اس کی اعانت کے لئے طیار ہو سکتے تھے، مگر وہ جانتا تھا کہ اس طرح دھمکا دھمکا کر کب تک کام نکالا جائے گا ضرورت ہے کہ کسی سیاسی چال سے مخالفوں کو زیر کیا جائے۔

۱۹۱۹ء میں اس نے رؤف و رفعت کی مدد سے ملک کے اندر دفاعی کمیٹیاں قائم کی تھیں اور رفتہ رفتہ ان کا زور بہت بڑھ گیا تھا اور چونکہ ان کمیٹیوں کی تنظیم بالکل فوجی قسم کی تھی اس لئے ان سب کی باگ مصطفےٰ کمال ہی کے ہاتھ میں تھی اس نے سوچا کہ ان مقامی کمیٹیوں کو "جمعیت ملی" کے نام سے موسوم کر کے تمام داخلی انتظامات کا اختیار ان کو دیدینا چاہئے اور چونکہ یہ کمیٹیاں اسی کے تحت ہیں اس لئے ملک کی تمام انتظامی مشین پر اس کا اقتدار قایم رہے گا۔

اس نے فوراً ملک کا دورہ شروع کیا۔ یہ جہاں کہیں پہونچتا تھا لوگ دیوانہ وار اس کی پذیرائی کرتے تھے، غازی اور بطل اعظم کے نعروں سے فضا گونج جاتی تھی اور یہ بھی ان کا دل ہاتھ میں لیکر سمجھاتا تھا کہ "دیکھو دشمن ملک سے چلا گیا ہے لیکن جنگ ابھی تک ختم نہیں ہوئی۔ ملک غداروں سے بھرا ہوا ہے اور ضرورت ہے کہ پوری مستعدی سے ان کا مقابلہ کرنے کے لئے میرا ساتھ دیا جائے۔ ترکی قوم نے اپنا خون بہا کر حاصل کیا ہے، اس لئے اس پر حکومت کرنے کا حق تمھیں کو حاصل ہے، اپنی کمیٹیوں کو مضبوط بناؤ، وسیع کرو اور وہ کرو جو میں کہتا ہوں"۔ الغرض اسی طرح اس نے ہر جگہ اپنے موافق اچھی خاصی جماعت پیدا کر لی اور اس کے بعد وہ اسمبلی کی قوت گھٹانے کی طرف متوجہ ہوا۔

مصطفےٰ کمال نے دورہ سے فارغ ہونے کے بعد سب سے پہلے یہ کام کیا کہ اس نے قانون اسمبلی کے سامنے یہ پیش کیا کہ ممبران اسمبلی کا گرفتاری سے مستثنیٰ ہونے کا قاعدہ منسوخ کیا جائے اور اس کے ساتھ ہی اس نے اخبارات کا سخت احتساب شروع کیا اور پولیس کو حکم دیا کہ پبلک میں کوئی شخص تقریر نہ کرنے پائے۔ اسمبلی نے اس قانون کو تو پاس نہ ہونے دیا لیکن احتساب اخبارات اور پولیس کا کیا علاج تھا۔ وہ لوگ سمجھتے تھے کہ مصطفےٰ کمال کا دورہ کیا معنی

دکھاتا ہے اور وہ کس فکر میں سرگرداں ہے لیکن کھلم کھلا اس کی مخالفت بھی نہ کر سکتے تھے۔ تاہم ایک موقعہ ان کے ہاتھ آہی گیا۔
صلح کانفرنس کے متعلق تمام کارروائیاں مصطفےٰ کمال نے راز میں رکھی تھیں اور جو کچھ کر رہا تھا اپنے ہی اختیار سے کر رہا تھا۔ کانفرنس نومبر سے جاری تھی اور ترکی کی طرف سے عصمت پاشا گفتگو کرنے کے لئے شریک ہوا تھا۔ لیکن وہاں حالات کچھ ایسے پیدا ہوئے کہ کانفرنس کامیاب نہ ہوئی اور عصمت فروری میں وہاں سے بگڑ کر انگورہ کی طرف چل پڑا مصطفےٰ کمال یہ سنکر بہت مشوش ہوا کیونکہ اسکی تمام کامیابیوں کا انحصار صرف اس پر تھا کہ کانفرنس میں بھی اسی کی جیت رہے، چنانچہ یہ فوراً اسکی شہر جاکر عصمت سے ملا اور پھر اس کو ساتھ لیکر انگورہ آیا۔ لیکن اسٹیشن پر نہ رؤف پاشا (وزیر اعظم) استقبال کیلئے آیا اور نہ کوئی اسمبلی کا ممبر۔ مصطفےٰ کمال نے برہم ہو کر رؤف کو بلایا اور جواب طلب کیا۔ اس نے کہا کہ "وزیر اعظم میں ہوں عصمت پاشا نہیں ہے، اس لئے میں اس کے لینے کے لئے اسٹیشن نہیں جا سکتا تھا، رہا آپ کا مسئلہ سو آپ کیوں بغیر مشورہ وزراء عصمت سے ملنے اسکی شہر چلے گئے" اور یہ کہکر اس نے وزارت سے استعفا دیدیا۔ اور اسوقت سے وہ عصمت کا دشمن اور مصطفےٰ کمال کا مقابل بن بیٹھا۔

اسمبلی کو یہ موقعہ مصطفےٰ کمال کی مخالفت کا ہاتھ آگیا اور کامل نو دن تک صلح کانفرنس کا مسئلہ زیر بحث رہا۔ مصطفےٰ کمال پر اسمبلی نے دو الزام قایم کئے ایک تو یہ کہ اس نے انگریزوں سے دھوکا کھا کر التوائے جنگ کو کیوں منظور کرلیا اور کیوں قسطنطنیہ پہونچکر سنگین کی نوک سے اپنے شرائط اسی وقت تسلیم کرا لئے، دوسرا الزام یہ تھا کہ بغیر منظوری اسمبلی عصمت ایسے بہرے شخص کو صلح کانفرنس میں شرکت کے لئے کیوں مامور کیا۔ اس لئے عصمت کے خلاف ملامت و بے اعتمادی کا ووٹ پاس کیا جائے۔

ہر چند مصطفےٰ کمال جانتا تھا کہ عصمت بیوقوف ہے لیکن چونکہ اس کا خاص آدمی تھا اور اندھوں کی طرح اس کا حکم ماننے والا تھا اس لئے وہ کسی طرح گوارا نہ کر سکتا تھا کہ عصمت کے خلاف کوئی کارروائی اسمبلی میں ہو، اس لئے اسنے بعض کو تو سمجھایا کہ یہ ساری ترکیب رؤف کی ہے جو خود صلح کانفرنس میں شریک ہونا چاہتا ہے، بعض کو وعدوں کا سبز باغ دکھا کر رام کیا اور بعض کو دھمکایا، الغرض عصمت کے خلاف ووٹ پاس نہ ہو سکا اور اس نے پھر اسی کو کانفرنس بھیجکر حکم دیا کہ کچھ بھی ہو وہاں کامیابی حاصل کرنا ضروری ہے۔

اس دوران میں مصطفےٰ کمال رات دن اس فکر میں لگا ہوا تھا کہ "جمعیت ملی" جو اس نے قائم کی ہے پورا اقتدار ملک میں حاصل کرے اور اُدھر اسمبلی اس خطرہ کو دور کرنے کی تدبیریں سوچ رہی تھی آخرکار اس نے ایک وفد مصطفےٰ کمال کے پاس بھیجکر مطالبہ کیا کہ بحیثیت صدر حکومت ہونے کے اس کو تمام پارٹیوں سے علحدہ اور بالکل نیوٹرل

رہنا چاہئے، مصطفےٰ کمال نے کہا کہ ملک میں صرف ایک ہی سیاسی جماعت کام کر رہی ہے جس کا نام "جمعیت ملی" اور جس میں ہم آپ سب شریک ہیں، پھر یہ فرق و امتیاز کیسا؟"

یہ جواب گویا اسمبلی کے نام کھلا ہوا چیلنج تھا۔ اور وہ لوگ بھی جنھوں نے گزشتہ چار سال میں مصطفےٰ کمال کا ساتھ دیا تھا رؤف کی سرکردگی میں علیحدہ ہو گئے۔ یعنی رحمی، عدنان، کاظم قرہ باقر، رفعت، علی فواد، اور نورالدین سب اس سے منحرف ہو گئے۔ البتہ عصمت و فوزی نے ساتھ نہیں چھوڑا، اور فوج بھی اس کی طرفدار تھی۔

اسمبلی کے ممبروں اور نمایندوں کی اب تنہا کوشش یہ تھی کہ کسی طرح مصطفےٰ کمال کے اقتدار کو گھٹایا جائے اور اس باب میں اس کے مخالفوں کی تعداد برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ مصطفےٰ کمال نے یہ دیکھ کر کہ اسمبلی میں اس کے ہمنوا کم ہوتے جا رہے ہیں، اسکو تحلیل ہو جانے کا حکم دیا اور دوبارہ انتخاب ممبران کی کارروائی عمل میں آئی، لیکن اس مرتبہ پہلے سے بھی زیادہ مخالف لوگ اسمبلی میں جمع ہو گئے۔ اب اس نے سوچا جو کچھ کرنا ہے کر ڈالنا چاہئے ورنہ ممکن ہے یہ موقعہ بھی ہاتھ سے نکل جائے۔

اس وقت حالت یہ تھی کہ "جمعیت ملی" کی قوت بہت بڑھ گئی تھی، تمام فوج مصطفےٰ کمال کے ساتھ تھی، اور اس کے بڑے بڑے مخالف رؤف، کاظم، علی فواد اور نورالدین انگورا سے باہر تھے عصمت پاشا صلح کانفرنس میں ترکی کے تمام مطالبات تسلیم کرا چکا تھا اور قسطنطنیہ دشمنوں کی فوج سے بالکل خالی ہو چکا تھا۔ اس لئے مصطفےٰ کمال نے سوچا کہ اعلان جمہوریت کے لئے اس سے بہتر وقت کوئی نہیں آسکتا، لیکن وہ جانتا تھا کہ اسمبلی میں اگر اس مسئلہ کو اٹھایا گیا تو وہاں کامیابی نہ ہوگی، اس لئے وہ نہایت ہی دانشمندانہ سیاسی چال چلا۔ اس نے کیبنٹ کے وزراء کو کھانے پر مدعو کیا اور ان سے کہا کہ "موجودہ صورت گورنمنٹ کی کسی طرح کامیاب نہیں ہو سکتی اور جب تک بات بات میں اسمبلی کی دخل در معقولات بند نہ ہو، انتظام دشوار ہے۔ اگر آپ لوگوں کو وزیر بنایا گیا ہے تو اس کے معنے یہ تو نہیں ہو سکتے کہ اسمبلی کے نمایندے ہر وقت آپ کے سر پر چڑھے رہیں۔ اگر کام کرنے کا پورا اختیار حاصل نہیں تو ایسی وزارت سے کیا فائدہ، اس لئے میری رائے میں آپ لوگ استعفا دیدیجئے اور دیکھئے کہ اسمبلی کیا کرتی ہے، ظاہر ہے کہ وہ آپ لوگوں کے خدمات حاصل کرنے پر مجبور رہے پھر آپ ہی کا انتخاب کرے گی، اس وقت آپ حسب منشاء شرائط عاید کر کے اپنا پوزیشن محفوظ کر سکتے ہیں۔"

چنانچہ کیبنٹ نے دوسرے دن استعفا دیدیا اور اسمبلی نے دوسری نئی گورنمنٹ کی تنظیم شروع کی، لیکن اسمبلی کے ممبروں میں باہم کئی دن تک جھگڑا رہا یہاں تک کہ آپس میں مار پیٹ کی نوبت آگئی۔

مصطفےٰ کمال یہ دیکھ کر بہت خوش ہو رہا تھا۔ اس نے فتحی سے کہا کہ "کل جتنی الجھن اسمبلی کے مباحثہ میں پیدا

کر سکتے ہو، پیدا کرو"۔ اور کمال الدین سے کہا کہ "تم اس وقت یہ تجویز پیش کرنا کہ مصطفےٰ کمال کو بلا کر اس جھگڑے کو طے کیا جائے"۔ مصطفیٰ کمال نے رات ہی کو عصمت کے مشورہ سے جمہوریت کے بل کا مسودہ طیار کر لیا اور کل کا انتظار کرنے لگا۔

دوسرے دن وہی ہوا جو وہ سمجھتا تھا، یعنی اسمبلی کے ممبروں کی باہمی مخالفت بہت زیادہ بڑھ گئی اور آخر کار اس پر رضامندی ظاہر کی گئی کہ مصطفیٰ کمال کو بلا کر کہا جائے کہ وہ نئی کیبنٹ مرتب کرے۔ اول اول تو مصطفےٰ کمال نے آنے سے انکار کیا لیکن جب بعد کو اس سے یہ کہلوا لیا کہ اس کے فیصلہ کو قطعی فیصلہ سمجھا جائے گا تو وہ آیا اور اس نے حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا کہ:- "جن مشکلات میں آپ لوگ مبتلا ہیں وہ سب آپ ہی کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ آپ لوگ بیشک قوم کے نمایندے ہیں، لیکن جب تک آپ وزراء کو اپنے فرائض انجام دینے کے لئے آزاد نہ چھوڑیں گے کبھی کام نہیں چل سکتا۔ آپ قانون بنائیے، نظم ونسق پر اصولی بحث کیجئے، لیکن ایک بار کیبنٹ بنا دینے کے بعد اس کے فرائض میں دخل نہ دیجئے اگر وہ اسمبلی کے بنائے ہوئے قانون پر عمل کر رہے ہیں۔ اس لئے میرے نزدیک اب صورت صرف یہی ہے کہ حکومت کے موجودہ نظام کو بدل دیا جائے اور میں بہ حیثیت حکم کے فیصلہ کرتا ہوں کہ آیندہ سے ترکی کی حکومت جمہوری حکومت ہوگی"۔

یہ سنتے ہی اسمبلی حیران رہ گئی، لیکن اب ہو بھی کیا سکتا تھا، مصطفےٰ کمال کو فیصلہ کا اختیار دے کر سب اپنے ہاتھ پاؤں کٹا چکے تھے۔ آخر کار جمہوریت کا بل پاس کیا گیا اور مصطفےٰ کمال کو اس کا صدر بنایا گیا۔

(باقی)

جمالستان

نیاز فتحپوری کے ۳۲ ادبی شاہکار افسانے جو اسی سال شائع ہوئے ہیں، اور ۵۷۵ صفحات پر محیط ہیں، پہلے اڈیشن کی جلدیں بہت کم رہ گئی ہیں۔ اگر آپ نے اس وقت تک اپنی لائبریری کے لئے طلب نہیں فرمایا تو اب سہی۔

قیمت مجلد للعہ، غیر مجلد للعہ، علاوہ محصول

منیجر نگار لکھنؤ

بیراگ کا بروگ

(گزشتہ سے پیوستہ)

(۹)

محل کی سب سے بلند منزل پر، جہاں رتن گڈھ راج کا پھیرا دور سے اُڑتا ہوا نظر آتا ہے، ایک ایسے کمرہ میں جس کے چاروں طرف تازہ ہوا کے لئے کوئی روک نہیں ہے، راجکماری کملا مسہری پر لیٹی ہوئی ایک کتاب پڑھ رہی ہے، جو سوامی جی نے کسی وقت اس کو تحفتاً دی تھی۔

بائیں کی طرف سوشیلا خاموش بیٹھی ہوئی راجکماری کے چہرہ اور اس کے رنگ کے اُتار چڑھاؤ کو غور سے دیکھ رہی ہے، سامنے میز پر متعدد دواؤں کی شیشیاں اور گلاس رکھے ہوئے ہیں۔

راجکماری تنزیب کی ہلکی ساری ہلکے زرد رنگ میں رنگی ہوئی پہنے ہوئے ہے اور تکیہ کے اوپر سر کے نیچے اپنا ہاتھ رکھے ہوئے کتاب دیکھ رہی ہے سر کے بال ہوا سے منتشر ہو کر کبھی کبھی پیشانی پر آجاتے ہیں، جن کو وہ کبھی دوسرے ہاتھ سے سر کے اوپر کر لیتی ہے اور کبھی نہیں ـــ اس کا چہرہ زرد ہے لیکن کتاب پڑھتے پڑھتے اس زردی میں ہلکی سرخی زعفران کی سی بھی پیدا ہو جاتی ہے، اس کا خوبصورت کتابی چہرہ، جو محبت کرنے والی عورت کی خاص پہچان ہے، اس وقت اور زیادہ اُترا ہوا نظر آتا ہے، اور شال کا زریں کنارہ سینہ سے ہوتا ہوا پشتِ گردن تک پہونچگیا ہے اس کے دل کی دھڑکن کا غماز بنا ہوا ہے

اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کتاب کو بند کیا اور کسی خیال میں محو ہو کر آنکھیں بند کرلیں۔ سوشیلا اس وقت غور سے اس کے مضمحل لیکن تابناک چہرہ کو دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ واقعی محبت بھی کوئی ایسا روگ ہے جس کا علاج اس دنیا میں ممکن نہیں ـــ راجکماری کی بند آنکھوں کے کنارے سے دفعتہً دو آنسو ڈھلکے اور وہ انھیں اپنی اُنگلیوں سے پونچھتی ہوئی اُٹھ بیٹھی ـــ سوشیلا کھڑی ہوگئی اور آگے بڑھنا چاہا، لیکن راجکماری نے اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھا تو وہ اپنی جگہ ٹھٹک کر رہگئی۔ وہ پھر لیٹ گئی اور تھوڑی دیر سوچکر بولی:۔

"سوشیلا، کیا واقعی میں بیمار ہوں"

—— "نہیں راجکماری، آپ کے دشمن بیمار ہوں، موسم بدل رہا ہے، اسی لئے طبیعت مضمحل رہتی ہے، خود میرا بھی حال ہے"
کملا، (تھوڑی دیر سوچکر، آپ ہی آپ) —— موسم بدل رہا ہے —— اسی لئے طبیعت مضمحل رہتی ہے -
(سوشیلا سے) اچھا تو پھر یہ علاج کیوں ہو رہا ہے -
سوشیلا - "راجکماری، علاج کسی بیماری کا تو نہیں ہے بلکہ صرف اس بات کا ہے کہ مبادا موسم کی خرابی سے مزاج ناساز ہو جائے"
کملا یہ سنکر آنکھ بند کئے پھر دیر تک خاموش لیٹی رہی اور پھر دفعتہً بولی - "سوشیلا، چترکوٹ تمھیں معلوم ہے کہاں ہے"
سوشیلا - "ہاں معلوم کیوں نہیں، سوامی جی اکثر اس کا ذکر کیا کرتے تھے، یہ مقام انھیں بہت پسند ہے -
کملا - "ہاں، تو پھر، اس موسم کو کیوں نہ بدل دیا جائے - چلو چترکوٹ چلیں، سُنا ہے وہاں کی آب و ہوا بہت اچھی ہے، اور ممکن ہے کہ ...." خاموش ہو گئی -
سوشیلا - "مناسب ہے لیکن دس دن کے اندر جانا اور واپس آنا —— مجھے تو اُمید نہیں کہ مہاراج مان جائیں"
یہ سنتے ہی کملا گھبرا کر اُٹھ بیٹھی، شال اُتار کر پھینکدی، اور کمرہ میں اِدھر سے اُدھر بیتابانہ ٹہلنے لگی —— سوشیلا سہمی ہوئی ایک کنارے کھڑی تھی اور وہ سمجھ رہی تھی کہ اسوقت کملا کس اُلجھن میں گرفتار ہے -
وہ ٹہلتے ٹہلتے دفعتہً میز کے پاس آکر کھڑی ہو گئی اور دیر تک دواؤں کو غور سے دیکھتی رہی - ایک شیشی کو ہاتھ میں لیا، دیکھا اور رکھدیا، دوسری کو لیا اور رکھدیا —— اس کے چہرہ کا رنگ غیر معمولی طور پر بدل رہا تھا، پیشانی پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں اور آنکھیں جو نقاہت کی وجہ سے یونہی زیادہ نمایاں ہو گئی تھیں، اسوقت ابلی پڑ رہی تھیں -
—— دوا - علاج - شفا —— احمق دنیا کی احمقانہ تدبیر، دل کی پھانس کو نہ دیکھ کر یہ پاؤں کے کانٹے نکالنے والے بیوقوف روح کے درد کو نہ سمجھکر پیشانی پر صندل لگانے والے کم عقل"
—— وہ یہ کہتی ہوئی پھر ٹہلنے لگی اور دفعتہً ایک جگہ ٹھٹھک کر بولی - "سوشیلا، یہ شیشیاں، یہ گلاس، اُٹھا کر پھینکدے یہ چیزیں مجھے بیمار ڈالدیں گی میں اب یہ زہر نہیں پی سکتی"
سوشیلا، جو پہلے ہی سے سہمی ہوئی تھی، یہ سُنکر تھر تھر کانپنے لگی - وہ سمجھتی تھی کہ اگر اس حکم کی تعمیل کی تو مہاراج کو کیا جواب دیگی اس لئے اس کے قدم جہاں تھے وہیں جمکر رہگئے —— اب کملا کا غصہ اور تیز ہو گیا اور وہ بغیر کسی انتظار کے میز کے پاس گئی اور ایک ایک کرکے تمام دوائیں پاس کی کھڑکی سے نیچے پھینکدیں - اور ایک ایسے سکون کے ساتھ جو بعض وقت انتہائی غیظ کی حالت میں پیدا ہو جاتا ہے - پاؤں لٹکا کر پلنگ پر بیٹھ گئی"
یہ واقعہ ایسا معمولی نہ تھا کہ چھپا رہتا - آن کی آن میں راجہ کو خبر پہونچ گئی اور وہ گھبرایا ہوا خود کملا کے پاس آگیا -

راجہ — "کیوں کملا، کیا حال ہے، یہ دوائیں کس نے پھینکدیں"

کملا — "میں نے"

راجہ — "کیوں، کیا بات ہوئی"

کملا — "کوئی بات نہیں، مہاراج، میں دوائیں پیتے پیتے گھبرا گئی ہوں اور اگر واقعی میں بیمار ہوں تو مجھے افسوس ہی کہ اسوقت تک ان میں سے کسی دوا نے اپنا کام نہیں کیا"

راجہ — "بہتر ہے، میں علاج بدلدوں گا، لیکن تمہیں غصہ ترک کرنا چاہئے تھا، طبیعت اور زیادہ بگڑ جائے گی"

کملا — "مہاراج، علاج کی تبدیلی بالکل بے سود ہوگی، اور مجھے معلوم ہے کہ میں یہاں اچھی نہیں ہوسکتی"

راجہ — "پھر تم کہاں اچھی ہوسکتی ہو"

کملا — "چتر کوٹ میں"

راجہ — "چتر کوٹ! چتر کوٹ! وہاں کون علاج کرنے والا ہے"

کملا — "رام چندر جی کے وہ چرن جو بن باس کے وقت وہاں پہونچے تھے اور جن کے نشان اب بھی اس جگہ موجود ہیں"

راجہ جو خود بھی واہمہ پرست ہندو تھا یہ سنکر خاموش ہوگیا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد بولا — "لیکن یہ تو دیکھو کہ اب دن کتنے باقی رہ گئے ہیں، تم اگر وہاں گئیں بھی تو ٹھہر نہیں سکتیں"

کملا — "میں زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ میں واپس آجاؤنگی"

راجہ (کچھ سوچکر) بہتر ہے اگر تمھاری مرضی یہی ہے تو جاؤ، کیونکہ تمہاری صحت کے لئے میں دنیا کی ہر مصلحت قربان کرنے کے لئے طیار ہوں۔

---

(۱۰)

چتر کوٹ کوہستان بندھیاچل کے اس حصہ کا نام ہے جہاں رام چندر جی نے بن باس کی حالت میں اپنی زندگی کے کچھ دن بسر کئے تھے اور اسی لئے یہ مقام ہندوؤں کے یہاں جاترا کی نہایت مقدس جگہ سمجھا جاتا ہے، تمام سال زائرین کا سلسلۂ آمد رفت قایم رہتا ہے اور بعض فقرا نے تو اپنا استھان ہی یہاں بنالیا ہے۔ بعض نے پہاڑ کی چٹانوں پر کٹیاں بنالی ہیں، بعض نے بڑی بڑی چٹانوں کے سایہ میں پناہ لے رکھی ہے، بعض نے کوہستانی چشموں کے پاس جھونپڑیاں ڈال لی ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو یونہی کھلی ہوئی جگہوں میں دھونی رما کر بیٹھ گئے ہیں۔

کملا صبح کو یہاں پہونچی اور اسی وقت سے کسی جستجو میں لگ گئی۔ نہ اب اس میں نقاہت پائی جاتی تھی، نہ کسی بیماری کا نشان، نہ اس کے چہرہ پر زردی تھی نہ اعضا میں اضمحلال۔ وہ پیادہ پا، ناہموار پتھروں پر ہرنی کی طرح دوڑتی پھرتی تھی اور اس طرح جستجو میں مصروف تھی گویا وہ ایک ایک چٹان کو اولٹ کر دیکھ لینے پر تلی ہوئی ہے۔

ظاہر ہے کہ میلوں کے گرد میں پھیلی ہوئی سادھوؤں کی آبادی کا تھوڑی دیر میں جایزہ نہ لے سکتی تھی، صبح سے شام ہوگئی اور آخر کار ایک ایسے استھان پر جو چشمہ کے کنارے ہونے کی وجہ سے بہت دلکش و سکون بخش تھا، وہ تھک کر بیٹھ گئی اور تھوڑی دیر میں اس کی آنکھ لگ گئی۔ اسوقت استھان خالی تھا اور سادھو کسی ضرورت سے دروازہ بند کرکے باہر گیا ہوا تھا۔

سورج غروب ہو رہا تھا، چڑیاں چشمہ سے پانی پی پی کر جھاڑیوں میں بسیرا لینے کے لئے جمع ہو رہی تھیں، ان کی نرم و دلکش آوازوں سے پہاڑی گونج رہی تھی اور سایہ بڑھتے بڑھتے تاریکی میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا کہ دفعتہً کملا کی آنکھ کھلی اور سب سے پہلے جس چیز پر اسکی نگاہ پڑی وہ سوامی جی کی صورت تھی۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی، آنکھیں مل مل کر دیکھنے لگی کہ یہ کوئی خواب تو نہیں ہے اور جب اسے یقین ہوگیا تو وہ تھر تھرا کر گرنے لگی۔ سوامی جی نے ہاتھ بڑھا کر اس کو سنبھال لیا اور کہا:۔

"کملا، میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں، تم یہاں کیونکر آئیں"

کملا خاموش، سر جھکائے ہوئے کھڑی تھی اور ایک خفیف سی مگر نہایت سریع لرزش اس کے تمام جسم پر طاری تھی وہ کچھ نہ بولی۔ سوامی جی نے پھر پوچھا، پھر کوئی جواب نہ ملا۔ پورے پندرہ منٹ اسی حال میں گزر گئے اور آخر کار جب سوامی جی نے یہ کہا کہ "کملا، بہت دیر ہوگئی ہے، چلو میں تم کو تمھارے ٹھکانے پہونچا دوں" تو وہ چونکی، جانے کے نام سے اسے دل پر چوٹ سی لگی اور بولی۔ "ٹھکانے پہونچانے، یا ٹھکانے لگانے، مہاراج میں یہاں سے جانے کے لئے نہیں آئی ہوں" یہ سنتے ہی سوامی جی کی حالت عجیب ہوگئی، چہرہ پر غیر معمولی رنگ دوڑ گیا، ہاتھ پاؤں میں بے چینی سی محسوس ہونے لگی، اعصاب میں بجلی سی دوڑ گئی اور کملا کا ہاتھ پکڑ کر اٹھے اور کہا کہ "اندر آؤ، یہاں سردی ہے اور تمھارے جسم پر ساری کے سوا کچھ نہیں"

دونوں اپنی جگہ ایک دنیائے تصور بنے بیٹھے ہیں، اور اگر ان کے اس عالم خیال کی کوئی مرئی تصویر لیجا سکتی تو شاید اس کا کوئی منظر اس حال سے خالی نہ ہوتا کہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہم آغوش ہیں۔ کچھ دیر بعد سوامی جی نے اٹھکر چراغ جلاتے ہوئے کہا۔ "کملا تمھارے بٹھانے کے لئے میرے پاس تو کوئی بوریا بھی ثابت موجود نہیں"۔ کملا نے کوئی جواب نہیں دیا اور بدستور اسی عالم محویت میں گردن جھکائے بیٹھی رہی۔

سوامی جی نے چراغ جلا کر کٹی کے ایک کونے سے لوٹتے ہوئے کہا "کملا، تم آج میری مہمان ہو، اور میں حیران ہوں تمھاری کیا سیوا

مجھ سے ہو سکتی ہے"۔۔۔۔ کملا نے پھر کوئی جواب نہیں دیا۔

سوامی جی نے اس کے قریب آ کر اس کا شانہ چھو کر کہا۔ "کیوں، کملا، کیا کچھ خفا ہو، جو جواب نہیں دیتیں"۔ شانہ پر ہاتھ کا لگنا تھا کہ کملا کی حالت ایسی ہو گئی گویا وہ شاخ بید ہے جس سے تیز ہوا کا جھونکا گزر گیا ہے، سوامی جی نے گھبرا کر پوچھا "یہ کیا حال ہے" لیکن یہ پوچھنا قیامت ہو گیا کیونکہ وہ سنتے ہی بے اختیارانہ ایک جسم بیجان کی طرح ان کی آغوش میں گر پڑی اور نہیں کہا جا سکتا کہ کب تک پڑی رہی۔ جس وقت اُس کی آنکھ کھُلی تو سوامی جی غائب تھے اور ان کی ایک تحریر سامنے پتھر پر رکھی ہوئی تھی۔

"کملا، میں نے اپنی زندگی میں دو عہد کئے تھے، ایک یہ کہ میں کبھی اس جسمانی لذت سے آشنا نہ ہوں گا جس سے تم بیتاب ہو کر میرے پاس آئی تھیں۔ اور دوسرے یہ کہ اگر کبھی مجھ سے ایسی لغزش ہو گئی تو پھر دنیا میں زندہ نہ رہوں گا۔ یاد کرو رتن گڑھ کی وہ صبح جب بجلی سے ڈر کر تم مجھ سے لپٹ گئی تھیں۔ میں کبھی اس لذت کو محو کرنے میں کامیاب نہیں ہوا، جو زندگی میں سب سے پہلی بار ایک نوجوان عورت کے جسم کے اتصال سے مجھے حاصل ہوئی تھی، اگر یہ کہوں کہ میرے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی تو یہ کہنا بھی صحیح نہ ہوگا، اگر میں اسے شراب کی بدمستی سے تعبیر کروں تو یہ بھی غلط ہوگا۔ وہ ایک کیفیت تھی ناقابل اظہار، ایک لذت تھی ناقابل بیان۔ تم چلی گئیں اور میں نے کامل دو گھنٹے غور کیا کہ کیا میرا عہد ٹوٹ گیا ہے۔ لیکن آخر کار میرے نفس نے دھوکا دیکر مجھے یہ باور کرایا کہ یہ جو کچھ ہوا صرف اتفاق تھا، قصد و ارادہ نہ میری طرف سے تھا اور نہ شاید تمھاری طرف سے، تاہم میں نے وہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر تم پھر مجھ سے ملیں تو ممکن ہے مجھے اس لذت کی یاد پھر ستایا کرے۔

میں جتر کوٹ چلا آیا، یہ خیال کر کے کہ تم بھی چند دن میں مجھے بھول جاؤ گی اور میں بھی۔۔۔ لیکن شام کو جب ناگہاں میں نے تمھیں یہاں پایا تو مجھے معلوم ہوا کہ نہ تم مجھے بھلا سکی ہو اور نہ میں تمھیں۔۔۔ میں سمجھ گیا کہ میرا نفس جو دھوکا ایکبار مجھے دیچکا ہے اسکی پاداش کا وقت آگیا ہے اور مجھے اس کے لئے طیار ہو جانا چاہیئے چنانچہ میں تمھیں اندر لے گیا، یہ سمجھکر کہ مجھے اپنا سب کچھ تم پر قربان کر دینا ہے اور جسوقت تم میری آغوش میں آکر بیہوش ہو گئیں، تو میں نے اپنی وہ تمام قربانیاں پیش کر دیں، میں کہ اسوقت تک میں نے کبھی کسی عورت کے جسم کو قصداً نہیں چھوا تھا، تم کو اپنے سے اسقدر قریب دیکھکر بالکل دیوانہ ہو گیا تھا اور نہیں کہہ سکتا کہ میں نے تمھاری آنکھوں تمھارے لبوں، تمھاری پیشانی، تمھارے ہاتھ، تمھارا سینہ، اور تمھارے پاؤں کو کس کس طرح اور کتنی بار چوما، اور آخر کار جب میں اپنے غلبۂ نفس سے تھک کر چور چور ہو گیا تو کتنی دیر تک تم کو اپنے سینہ سے لپٹائے ہوئے پڑا رہا۔

تم یہی چاہتی تھیں نا؟۔

ظاہر ہے کہ اس کے بعد مجھے دُنیا میں کسی اور لذت کی جستجو نہیں ہو سکتی، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اب میں عہد کے دوسرے حصہ کو پورا نہ کروں۔ جان دینے سے زیادہ سہل دنیا میں کوئی بات نہیں اور شاید اچھا ہوتا اگر میں تمھارے پاس ہی دم توڑتا، لیکن اس خیال سے کہ ممکن ہے تم بعض اُلجھنوں میں گرفتار ہو جاؤ یا میرا خط دیکھنے سے پہلے ہی مبادا خود جان دیدو یہاں سے دور اتنی دور کہ تمھارا وہم و خیال بھی نہیں پہونچ سکتا، اپنا عہد و پیمان پورا کرنے جا رہا ہوں اور تم یہ یقین کرو کہ میں نے اسے پورا کر دیا اور اس دنیا میں اب تم مجھے کبھی نہیں دیکھ سکتیں۔ تاہم مری ایک التجا ہے، اگر تم نے اسے پورا کیا تو خیر ورنہ تم سے شکوہ و شکایت کرنے اب کون آتا ہے۔

ایک تو یہ کہ تم چترکوٹ سے فوراً رتن گڈھ جاؤ اور اپنے دل پر اس طرح قابو رکھو کہ یہ راز کسی پر ظاہر نہ ہو، دوسرے یہ کہ تم شادی ضرور کرو، لیکن یہ شادی صرف اس لئے ہو گی کہ تم بدنام نہ ہو، تمھارے باپ کی خواہش پوری ہو جائے ورنہ تمھاری روح تو پہلے ہی سے میری تھی، اب تمھارا جسم بھی میرا ہی ہو چکا ہے، اور اُسے میرا ہی رہنا چاہئے۔

---

(۱۱)

اس واقعہ کو ایک ماہ سے زیادہ زمانہ گزر گیا ہے اور راجکماری کملا شادی کے بعد جگدیش پور جا چکی ہے۔

راجہ جگدیش پور ایک معمولی دل و دماغ اور نہایت ادنیٰ خصائل کا نوجوان ہے۔ جس کا کچھ علم تو کملا کو شادی سے پہلے ہی ہو چکا تھا لیکن شادی کے بعد جب وہ یہاں پہونچی تو اور زیادہ پوست کندہ حالات معلوم ہوئے۔ دنیا بھی کہتی تھی اور کملا خود بھی جانتی تھی کہ اس نے شادی صرف دولت کی طمع میں کی ہے لیکن ایک تو اپنے باپ کی بات کا پاس، دوسرے سوامی جی کی وصیت، وہ اس باب میں بالکل خاموش رہی اور اس نے شادی کی تمام رسمیں اس طرح ہو جانے دیں گویا کہ وہ کوئی پتھر کی مورتی ہے۔

جگدیش پور پہونچنے کے بعد کملا کو معلوم ہوا کہ یہ اس کے شوہر کی پہلی شادی نہ تھی، بلکہ یہ شرف اس سے قبل ایک فرانسیسی عورت کو عرصہ ہوا حاصل ہو چکا ہے جو رانی کی حیثیت سے محل میں حکومت کر رہی ہے۔ یہ ایک کمرہ میں جو اس کے لئے مخصوص تھا، جا کر پڑ رہی اور کامل ایک ہفتہ تک نہ اس نے اپنے شوہر کی صورت دیکھی نہ اُس نے اپنی بیوی کی۔ وہ لاکھوں کی دولت پا کر اپنی فرانسیسی محبوبہ کے ساتھ ہر وقت نشۂ شراب میں بدمست رہتا تھا اور اسے دین و دنیا کا کوئی ہوش نہ تھا۔

آفتاب غروب ہو چکا تھا، محل برقی روشنی سے جگمگا رہا تھا، ڈیوڑھی پر شہنائی بج رہی تھی، اور کملا ہاتھ منھ دھو کر برآمدہ میں نکلی ہی تھی کہ خادمہ آئی اور بولی کہ "مہاراج نے یاد فرمایا ہے"۔ اس نے کچھ دیر تامل کیا، سوچا کہ یہ ایک ہفتہ کے بعد اسے کیوں یاد کیا جا رہا ہے۔

پوچھا۔ "کہاں یاد کیا ہے" جواب ملا "باغ کی بارہ دری میں" ۔۔ کملا نے سوال کیا۔ "کوئی اور بھی ہے"۔ خادمہ نے کچھ رکتے ہوئے جواب دیا کہ "مجھے معلوم نہیں"۔

کملا جس طرح کھڑی تھی اسی طرح چلنے کے لئے طیار ہوگئی اور متعدد زینے اور کمرے طے کرنے کے بعد جب وہ صحن باغ میں پہونچی تو دیکھا کہ سامنے راجہ بیٹھا ہوا ہے اور اس کے پہلو میں اس کی فرانسیسی بیوی بھی بیٹھی ہوئی ہے ۔ پہلے تو یہ ٹھٹھکی لیکن پھر کچھ سوچ کر آگے بڑھی اور قریب جاکر کہا کہ "میں حاضر ہوں"۔

راجہ کے سامنے میز پر شراب کی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں، اور ایک گلاس شراب سے لبریز اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے غضب آلود نگاہوں سے کملا کو دیکھا اور پھر شراب کا ایک جرعہ لیکر پوچھا کہ "کیا تم شراب نہیں پیتیں"۔

—— "نہیں، مہاراج، مجھے اس کی عادت نہیں ہے"

—— "اگر میں تم کو حکم دوں تو بھی نہیں پیوگی"

—— "یقیناً نہیں"

وہ غصہ سے بیتاب ہوگیا اور ماتھے پر شکنیں ڈالکر زہر خند کے ساتھ بولا کہ:۔

"ہاں، سچ ہے، سادھوؤں کے ہاتھ سے پریم کا جام پینے والیاں، ہمارے ساتھ کیوں شراب پینے لگیں"۔ ان الفاظ کا کملا کے دل و دماغ پر اک بجلی کا سا اثر پیدا ہوا اور بے اختیار اس کا جی چاہا کہ بڑھکر اس کا منھ نوچ لے لیکن اس نے انتہائی ضبط سے کام لیا اور وہاں سے واپس آنے لگی۔

راجہ نے کہا۔۔ "کہاں جاتی ہو، خبردار جو آگے قدم بڑھایا"

کملا پلٹ پڑی اور فوراً بڑھکر گلاس اسکے منہ پر پھینک مارا اور میز الٹ کر اس طرح خاموش کھڑی ہانپنے لگی گویا کہ وہ کوئی بپھری ہوئی شیرنی ہے ۔ راجہ نے جو اس وقت غصہ سے اندھا تھا، فوراً اپنی جیب سے ریوالور نکالا اور بولا کہ سنبھل جا۔ کملا جس کے لئے اب زندگی کوئی معنی نہ رکھتی تھی، کڑک کر بولی کہ "نامرد، مجھے ڈراتا ہے" یہ کہکر اس نے اپنی قمیص کا گریبان دونوں ہاتھوں سے پھاڑ کر سینہ آگے کر دیا اور بولی کہ "بڑا راجپوت ہے تو ہاتھ اٹھا اور فیر کر" ۔۔۔ ظاہر ہے کہ اس طعن کی تاب وہ کیا لاسکتا تھا۔ چشم زدن میں ریوالور کی نال کملا کے سینے کے سامنے آئی اور ایک دھماکے کی آواز نے اس "بیراگ کے بروگ" کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔

اس کے دوسرے دن اخباروں میں صرف یہ خبر دیکھنے میں آئی کہ:۔

"راجکماری کملا، کل شام کو موٹر میں جا رہی تھیں کہ دفعتہً کسی درخت سے تصادم ہوا اور پسلیاں ٹوٹ کر فوراً دم نکل گیا"۔

نیاز

چار مصلح

وہ نقاش تھے۔ وہ مصور تھے۔ وہ معلمِ اخلاق تھے، ماہرِ نفسیات تھے۔ وہ ڈرامہ نگار تھے، ناول نویس تھے۔ وہ بے نظیر شاعر تھے، بے مثل فلسفی تھے۔ وہ حاذق حکیم تھے، کامل طبیب تھے۔ وہ منجم تھے، رمال تھے۔ وہ مذہبی پیغمبر تھے۔ قومی مصلح تھے۔ مگر انسان تھے خدا نہیں تھے۔

ان کی قوتِ تفہیم حیات انسانی کے اسرارِ سربستہ کی عقدہ کشائی کر سکتی تھی۔ وہ اپنی روح کے اعماق میں پہونچکر، دل کی گہرائیوں میں ڈوب کر ان رموز کا پتہ لگا لیتے تھے جو ماورائے ادراک ہوں۔ پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کا حل ان کے لئے آسان تھا۔ وہ ستاروں کی حقیقت سمجھتے تھے۔ پرندوں کی زبان جانتے تھے۔ نظامِ شمسی ان کے سامنے بازیچۂ اطفال تھا۔ مریخ جسموں سے ہمکلام ہونا ان کے لئے مشکل نہیں تھا۔ وہ قدیم روحوں کو بلا سکتے تھے۔ وہ قیافہ شناس تھے۔ رنگِ رخ سے تاثراتِ قلبی معلوم کر لیتے تھے۔ ذی الحس تھے۔ قوی الفہم تھے۔

انھوں نے بیڑا اُٹھایا تھا ہم جنسوں کی اصلاح کا۔ وہ متفق تھے دنیا میں انقلاب پیدا کرنے پر۔ وہ متمنی تھے فرسودہ رسوم وقیود سے آزاد ہو کر ایک جدید نظامِ معاشرت قائم کرنے کے۔ وہ بدل دینا چاہتے تھے ماضی کو حال میں اور حال کو مستقبل میں۔

وہ چاروں جمع ہوئے عظمتِ رفتہ کی یادگار ایک شکستہ آثار گنبد میں جہاں صدیوں سے حیاتِ انسانی نے سانس نہیں لیا تھا۔ وہاں ان کے لئے نہ مرمریں میزیں تھیں۔ نہ آبنوسی کرسیاں۔ نہ ان کے تجربات کے لئے معمل نہ مطالعہ کے لئے کتب خانے نہ پروازِ تخئیل کے لئے شاعرانہ فضا۔ نہ پیچیدہ مسائل پر بحث وتمحیص کے لئے عالمانہ ماحول۔ وہ ان بے ثبات چیزوں سے بالکل بے نیاز تھے مستغنی محض تھے۔ ان کے دماغ ان کے معمل تھے۔ ان کے دل اِن کے کتب خانے۔ وہ تمام علوم میں، ہر علم کے تمام شعبوں میں تحصیل کمال کر چکے تھے۔

مسلسل سات ہفتہ تک وہ ایک دوسرے کے چہرے پر نظریں جمائے غور کرتے رہے اور اس نتیجہ پر پہونچے۔ کہ تمدنِ عالم میں تدریجی انقلاب پیدا کیا جائے۔ لیکن ابتدا کس پہلو سے ہو؟ —— یہ فیصلہ نہ کر سکے۔ انھوں نے پھر سوچنا شروع کیا۔ گیارہ ہفتے گذر گئے۔

آخر ایک نے کہا۔" املاک میں مساوات نہایت ضروری ہے۔ سرمایہ داری کو دنیا سے نیست ونابود کر دینا چاہیئے۔ کسی شئے پر قبضۂ انفرادی نہ ہو۔ تمام پیداوار، تمام آمد وخرچ متعلق ہو پوری قوم سے۔ لیکن قومیت کسی ملک کے مخصوص دائرے تک محدود نہ ہو۔ بلکہ قوم نام ہو۔ اقصائے عالم میں بسنے والی تمام نوعِ انسان کی ہئیتِ اجتماعی کا۔"

پندرہ ہفتہ بعد دوسرے مصلح کے رنگِ رخ پر اطمینان کے آثار نظر آئے اور اس نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا "مسئلۂ ازدواج قابلِ ترمیم ہے بلکہ لائق تنسیخ ہے۔ شادی کا موجودہ مفہوم حرفِ غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے۔ تعلقاتِ جنسی قائم ہوں لیکن بغیر کسی مخصوص رسم ورواج کے، بغیر کسی مشروط عہد وپیماں کے۔ اصناف کو کامل آزادی ہو۔ کوئی کسی کی زوجہ نہ بنے۔ کوئی کسی کا شوہر نہ ہو۔ نہ ماں اپنے بیٹے کے لئے ناجایز ہو نہ بیٹا اپنی ماں کے لئے حرام سمجھا جائے۔ بھائی کو بہن سے احتراز نہ ہو۔ بہن اپنے بھائی سے اجتناب نہ کرے۔ کسی کو ضبط تولید کی ضرورت لاحق نہ ہو۔ کسی کے دل میں افزائشِ نسل کی تمنا نہ رہے نوزائیدہ بچوں کی پرورش صرف حکومت کی طرف سے ہو۔ حکومت ہی انھیں تعلیم دے۔ بادشاہ ان کا مربّی ہو۔ اور وہ بادشاہ کے متبنّے کہلائیں عزیز واقارب کا رشتہ قائم نہ ہو۔ صرف باہمی محبت تعلقات کی وسیط بنے۔"

سترہ ہفتہ بعد تیسرے مفکر نے نظر اٹھائی۔ گردوپیش کی چیزوں پر نگاہ ڈالی۔ اور اطمینان کا سانس لیکر کہا۔ "ہم کو دنیا سے کام کاج کا قلع قمع کر دینا چاہئے۔ ہاتھ پاؤں ہلانے کی ضرورت نہ رہے۔ ہر کام از خود ہو جایا کرے۔ سائنس بہت ترقی کر گئی ہے۔ ہمیں جدید ترین آلات اور انکشافاتِ حاضرہ سے امداد لینی چاہئے۔ آہنی انسان ہماری خدمت کریں۔ مشینوں اور برقی قوتوں کے ذریعہ فصل تیار کیجائے بجلی ہمارے خورد ونوش کا انتظام کرے۔ صرف سورج کی شعاعیں اور کہربائی لہریں ہماری معالج ہوں۔ ہمارا کام صرف اس قدر ہو کہ ہم ہوائی جہازوں میں بیٹھ کر فضائے بسیط کی سیر کرتے پھریں مطالعۂ قدرت شغلِ حیات بن جائے اور بس۔"

اکیس ہفتہ بعد چوتھے فلسفی نے اپنے طلسمِ محویت کو توڑا اور آسمان کی طرف نظر اٹھا کر کسی قدر بلند لہجہ میں کہا۔ "مذہب نام ہے فرسودہ توہمات کے گمراہ کن مجموعہ کا جس کی دورِ حاضرہ میں ضرورت نہیں وہ عقائد جنکی صداقت کا تجزیہ منطقی استدلال کی رو سے غیر ممکن ہو لائق پذیرائی نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح جب تک خدا کے غیر حقیقی وجود کا تصور ذہنِ انسانی پر مسلط رہیگا۔ وہ ہر قسم کی ترقی سے محروم رہینگے۔ لہذا خدا اور مذہبیت کے نقوشِ باطل کو لوحِ قلب سے مٹا دینا چاہئے"۔ وہ عرصۂ دراز تک ایکدوسرے کے نظریہ پر غور کرتے رہے۔ کہ کون سا زیادہ افضل ہے نیز یہ کہ اسے کس طرح دائرۂ عمل میں لایا جائے۔ آخر وہ متفقہ طور پر اس نتیجہ پر پہونچے کہ سب سے پہلے کرۂ ارض سے نوعِ انسان کو نیست ونابود کر دیا جائے۔ اور غالباً انھوں نے اس تجویز کو دائرۂ عمل میں لانے کے لئے اپنی ہی چار ہستیوں سے ابتدا کی۔ کیونکہ دوسرے دن اسی گنبد میں مردہ حالت میں ملے جہاں صدیوں سے حیاتِ انسانی نے سانس نہیں لیا تھا۔ تاہم کسی کو خبر بھی نہ ہوئی کہ وہاں دنیا کی اصلاح کے لئے چار نظرئے قائم ہوئے اور ہو کر رہ گئے۔

فضل حق قریشی دہلوی

باب الاستفسار

مذہب و مذہبیات

(جناب سید احمد صاحب نظر حسینی علم۔ سرائے بوہرہ۔ حیدر آباد دکن)

میں آپ سے ایک مختصر سوال کرنا چاہتا ہوں کہ دنیا میں سیکڑوں مذاہب وجود میں آئے اور فنا بھی ہو گئے۔ اقوام عالم نے ہزاروں قوانین بنائے اور مٹا ڈالے۔ ہر قوم نے اپنے اخلاق کا ایک جداگانہ معیار قائم کیا تھا۔ لیکن کسی مذہب نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ دین فطرت ہے اور ہمیں بھی ان کے مطالعہ سے یہی معلوم ہوا کہ ان کے پیش کردہ مذہب کی صورت سے دین فطرت ہونے کی صلاحیت ظاہر نہیں ہوئی البتہ اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ دین فطرت ہے اور اس کا غائر مطالعہ کرنے سے اس میں جامعیت اور فطرت کے عین مطابق ہونے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔

اسلام کا یہ دعویٰ بھی کہ وہ آدم سے تا ایندم موجود ہے صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ زمانہ صداقت سے خالی نہیں رہا کرتا البتہ اقوام عالم نے غلطی سے مذہب کے خط و خال مٹا کر بزعم خود مذہب کو ایک نئی صورت میں ڈھال دیا۔ اور بعد میں گمراہ ہو گئے۔

وجہ تحریر ہذا یہ ہے کہ میں جناب کے خاص خیالات اس مسئلہ پر معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آیا جو صورت اسلام کی اس وقت پیش نظر ہے آیا وہی اصلی ہے جسے آپ مولویوں کے اسلام کے نام سے تعبیر فرماتے ہیں یا کوئی اور۔ بصورت ثانی کیا اس وقت اسی غلطی کا اعادہ تو نہیں ہو رہا ہے جو گزشتہ اقوام نے کی تھی۔ اور جو بالآخر گمراہی پر منتج ہوئی۔ اس مسئلہ پر بھی غور کرنا ضروری ہے کہ آیا مذہب کو دنیا کا ساتھ دینا چاہئے یا دنیا کو مذہب کا۔ اس لئے انسانی فطرت میں یہ داخل ہے کہ ہمیشہ کامل آزادی چاہتا ہے۔ پھر اخلاق و قانون کی بندش جس کی بنیاد مذہب کے اصول پر رکھی جاتی ہو ضروری ہے یا نہیں۔ اور ایسی تحدید جو مذہب قائم کرتا ہو انسان کے لئے مفید ہو یا مضر۔ علمائے یورپ و اسلام نے کیا ایسی تحدید کو مضر بتلایا ہو یا کامل آزادی کو ضروری قرار دیا ہو۔ براہ کرم نگار کے ذریعہ ان مسائل پر روشنی ڈالئے تو عنایت ہے۔

(**نگار**) آپ نے اپنے استفسار کے ذریعہ سے معناً وکنایۃً چند دعوے پیش کئے ہیں:-

ایک — یہ کہ تمام مذاہب عالم میں اسلام ہی نے فطری دین ہونے کا دعویٰ کیا اور غائر مطالعہ کرنے سے بھی اس کا یہ دعویٰ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

دوسرا — یہ کہ اسلام کا وجود "آدم سے تا ایندم" دنیا میں ہمیشہ پایا گیا ہے، لیکن اقوام عالم غلطی سے اسکی صورت مسخ کرتے رہے۔

تیسرا — یہ کہ اگر زمانۂ حال کے مولویوں کے بتلائے ہوئے اسلام کو اصلی اسلام نہ سمجھا جائے تو یہ غلطی و گمراہی ہوگی — اور

چوتھا یہ کہ — دنیا کو مذہب کا ساتھ دینا چاہئے، مذہب دُنیا کا ساتھ دینے پر مجبور نہیں ہے۔

قبل اس کے کہ میں آپ کے ان دعاوی پر کوئی تنقید کروں مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے "دین فطرت" کا کوئی مفہوم متعین کر لیا جائے۔

غالباً آپ کو اس سے انکار نہ ہوگا کہ "دین فطرت" سے مراد وہی دین ہو سکتا ہے جو "فطرت انسانی" کے اقتضاء کے مطابق واقع ہو یا بالفاظ دیگر یوں کہئے کہ جس میں فطرتِ انسانی کے اصلاح کی اہلیت پائی جائے۔ اب سوال یہ ہے کہ "فطرت انسانی" کا اقتضاء کیا ہے اور اس کی اصلاح و ترقی کیا معنی رکھتی ہے۔

اس سلسلہ میں جب آپ تاریخ عالم کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ انسان ترقی کی جس منزل سے گزر رہا ہے وہ اسے دفعتہً حاصل نہیں ہوئی، بلکہ لاکھوں سال کے تدریجی ارتقاء کا نتیجہ ہے۔ ایک زمانہ تھا جب وہ درندوں اور جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتا تھا، اس کے بعد حجری عہد آیا جب پتھر کے آلات واوزار طیار کرکے تمدن کی بنیاد اس نے قائم کی، پھر اسنے اور ترقی کرکے کاشت و زراعت شروع کی، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اس نے اپنے ذہن و دماغ سے کام لیکر مشینیں ایجاد کیں جہاز بنائے، ریل طیار کی، بجلی کو اپنے قابو میں کیا اور تمام موجودات عالم پر مالکانہ متصرف ہو گیا۔

اچھا فرض کیجئے کہ مذہب ہمیشہ سے ہر زمانہ میں موجود رہا ہے (جیسا کہ آپ نے دعویٰ کیا ہے) اور کوئی نہ کوئی نبی یا پیغمبر ہر دور میں پایا گیا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ نبی یا مُصلح اپنے ہی دور کے انسانوں میں سے منتخب ہوتا ہوگا اور یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ عہد وحشت کے انسانوں کا پیغمبر عہد حجری کا انسان رہا ہو یا عہد حجری کا پیغمبر عہد فلزاتی کے انسان کی طرح ہو۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ مذاہب عالم میں جو تدریجی ترقیاں ہوئی ہیں وہ بھی انسان کے ذہنی ارتقاء کی پابند تھیں جب انسان بالکل وحشی تھا تو اس عہد وحشت کے پیغمبر نے اس کو بُت پرستی سکھائی اس کے بعد جب انسان آہستہ آہستہ متمدن ہو تا گیا تو پیغمبروں کی تعلیم بھی اسی کے ساتھ بدلتی گئی یہاں تک کہ وہ خدا جو کسی وقت صرف پتھر کی مورت تھا زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو کر ایک مجرد قوت میں تبدیل ہو گیا۔

اس بیان سے آپ کے چاروں دعووں کی تردید ہوگئی، لیکن بہ خیال مزید وضاحت میں سلسلہ وار آپ کے ہر دعوے کو لیکر بتانا چاہتا ہوں کہ بدقسمتی سے آپ کسی ایک بات میں صحیح نتیجہ پر نہیں پہونچے۔

۱۔ آپ کا یہ کہنا کہ تمام مذاہب عالم میں اسلام ہی نے فطری ہونے کا دعویٰ کیا اور غائر مطالعہ سے بھی اس کا یہ دعویٰ صحیح معلوم ہوتا ہے بالکل بے بنیاد ہے، کیونکہ جو مذہب جس زمانہ میں پیدا ہوا وہ اسی زمانہ کے انسانوں کے عقول و اذہان کے مطابق پیدا ہوا اور اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اُسے فطری نہ کہا جائے، کیونکہ فطرت انسانی زیادہ سے زیادہ جس خیال کو قبول کر سکتی تھی اسی کو مذہب نے پیش کیا، اور اس سے آگے مذہب بڑھ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ مذہب کے مبلغ بھی تو آخر اسی دور کے ہوا کرتے تھے اور وہ اس حد سے آگے کیونکر بڑھ سکتے تھے جس حد تک انسان کی ذہنی ترقی اُن کے دور میں ہو چکی تھی۔

۲۔ آپ کا یہ فرمانا کہ اسلام کا وجود آدم سے تا ایندم دنیا میں ہمیشہ پایا گیا ہے لیکن اقوامِ عالم غلطی سے اس کی صورت مسخ کرتے رہے، بالکل میری سمجھ سے باہر ہے۔ اگر میں آپ کے اس دعوے کو تسلیم کر لوں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اسلام اول اول بُت پرستی کی شکل میں پیدا ہوا تھا اور بعد کو لوگوں نے اُس سے منحرف ہو کر بُت پرستی کی مخالفت شروع کر دی۔ اور اگر آپ یہ فرمائیں کہ اسلام نے بُت پرستی کی تعلیم کبھی نہیں دی تو پھر آپ ہی بتائیے کہ انسان کے عہد وحشت میں وہ کس صورت میں پایا جاتا تھا۔ البتہ اگر آپ یہ کہیں کہ اسلام نام ہی اُس مذہب کا ہے جو مختلف زمانوں میں حالات کے لحاظ سے مختلف صورتوں میں نمودار ہوتا رہا تو بیشک یہ ایک حد تک صحیح ہو سکتا ہے لیکن پھر اسی کے ساتھ آپ کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اگر جاہل و وحشی انسان کے ابتدائی دور میں وہ بت پرستی تھا تو انتہائی دور ارتقاء میں انکارِ خدا کی حد تک پہونچ سکتا ہے، اگر عقول انسانی یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کرے۔

۳۔ آپ کا یہ دعویٰ کہ زمانۂ حال کے مولویوں کا بتایا ہوا مذہب عین اسلام ہے اور اس سے ہٹنا غلطی و گمراہی، بہت کچھ بحث و تنقید چاہتا ہے لیکن میں گفتگو کو مختصر کرنے کے لئے آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ زمانۂ حال کے مولوی کا بتایا ہوا مذہب کونسا ہے؟ کیا یہ مذہب وہ ہے جو سنیوں کے مولویوں نے بتایا ہے؟ کیا یہ مذہب وہ ہے جسے شیعہ جماعت کے مجتہدوں نے ظاہر کیا ہے؟ کیا یہ مذہب وہ ہے جسکی تبلیغ وہابی مولوی کیا کرتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس کے جواب میں آپ اپنے ہی مسلک کے مولوی کی نشاندہی کر دیں گے، درانحالیکہ آپ کا وہی مولوی دوسرے مسلک والوں کے نزدیک جو یقیناً خود بھی مسلمان ہیں بالکل گمراہ ہے۔ پھر بتائیے کہ وہ شخص جو واقعتاً یہ سمجھنا چاہتا ہے کہ اسلام کا صحیح مفہوم کیا ہے، اس صورت میں کیا کرے گا۔ وہ مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کے مذہبی لٹریچر کو دیکھے گا اور جب اسے معلوم ہوگا کہ ہر مسلک دوسرے مسلک کو بُرا کہنے کے لئے کوئی نہ کوئی دلیل ضرور رکھتا ہے، تو لامحالہ وہ سب سے متنفر ہو جائے گا اور یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوگا کہ یہ تمام مسالک لغو ہیں۔

اس وقت آپ اسلام کا کوئی مفہوم ایسا متعین نہیں کر سکتے جس پر تمام جماعت اسلامی کو اتفاق ہو اور اس لئے اب آپ ہی بتائیے کہ اسلام کسے کہتے ہیں اور کس مولوی کا بتایا ہوا اسلام قابل اعتبار ہے۔

— اتنی گفتگو کے بعد آپ کا چوتھا دعوےٰ از خود باطل ہو جاتا ہے، کیونکہ جب تک تمام دنیا کسی ایک مذہب کی پابند نہ ہو جائے یہ کہنا کہ دنیا کو مذہب کا ساتھ دینا ضروری ہے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ بیشمار مذاہب میں سے کسی ایک مذہب کو اگر حسن بھی لیا جائے تو بیکار ہے کیونکہ نوع انسانی کا اختلاف دیگر مذاہب کی وجہ سے بہر حال باقی رہیگا اور اس صورت میں مذہب کی پابندی بجائے مُفید ہونے کے مضرت رساں ثابت ہوگی اور جنگ کا دروازہ ہر وقت ہر جماعت کے لئے کُھلا رہیگا۔

علاوہ اس کے یوں بھی دنیا کو مذہب کا ساتھ دینے پر مجبور سمجھنا بالکل خلافِ حقیقت اور فطرت کے منافی ہے۔ کیونکہ مذہب خود ہمیشہ انسانی دماغ کے رجحانات کے ساتھ ساتھ بدلتا رہا ہے اور اگر وہ انسان کی ترقی تمدن و معاشرت کا ساتھ دینے کا اہل نہیں ہے، تو اس کا عدم و وجود برابر ہے۔

اسلام میں اگر کوئی خصوصیت پائی جاتی ہے تو صرف یہی کہ وہ زمانہ کا ساتھ دینے والا ہے اور اسی لئے اس کو دینِ فطرت کہہ سکتے ہیں، لیکن اس صورت میں آپ اُس کو کسی ایک سطح پر قایم نہیں کر سکتے نہ کوئی خاص مفہوم اس کا متعین کر سکتے ہیں۔ وہ زمانہ کے ساتھ بدلتا رہیگا، انسانی عقول کے ساتھ خود بھی ترقی کرتا رہیگا، اور جس طرح اسوقت وہ اسلاف کی کتابوں میں ڈھونڈھنے سے کہیں نہیں ملسکتا، بالکل اسی طرح وہ مستقبل میں حال کے لٹریچر سے غائب ہو جائے گا۔ کیونکہ اسلام نام ہے محض نوع انسانی کی ترقی و استعلاء کا، عروج و ارتقاء کا، اور ہر اس سانچے میں ڈھل جانے کا جو زمانہ کا اقتضاء ہے — اور اگر مولوی واقعی کوئی مفہوم اسلام کا اتنا وسیع پیش کر سکتا ہے تو آپ کیا سارا زمانہ اسکے ماننے کے لئے طیار ہے، ورنہ یوں محض ذکر حور و قصور کی ترغیب اور ہاویہ جہنم کی تخویف سے تو اب یہ "کارگاہ مینائی" چلتا ہوا نظر آتا نہیں، ایک مذہب کا صحیح فریضہ روحِ عمل پیدا کرنا ہے، لیکن روحِ عمل سے مراد عبادت نہیں کہ یہاں نمازیں پڑھو اور وہاں حوریں لو، بلکہ ایک عزمِ مردانہ کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہونا مراد ہے، زمین کے سینہ کو چیر کر اسکے اندر چھپی ہوئی سعادت و برکت حاصل کر لینا اور فکر و تدبر سے کائنات پر چھا کر عناصر عالم پر حکمرانی کرنا مقصود ہے — یہیں اسی دنیا میں، اسی زندگی میں، اسی سرزمین پر — اور اسی وقت — پھر اگر اسلام کا واقعی یہی مفہوم ہے اور "انتم الاعلون ان کنتم مومنین" کی تعلیم سے یہی مقصود ہے تو آیندہ کبھی اسکا خیال بھی دل میں نہ لائیے کہ مذہب زمانہ کا ساتھ دینے پر مجبور نہیں اور مولویوں کا بتایا ہوا اسلام صحیح ہے — لیکن اگر اسلام کا مفہوم یہ نہیں ہے اور "انتم الاعلون" سے یہاں کی ذلت و نکبت اور وہاں کی "اعلیٰ علیین" مراد ہے تو آپ کو آپ کا اسلام مبارک ہو، تنہا جنت میں جا کر مزے اُڑائیے اور ہمیں دوزخ ہی میں رہنے دیجئے کہ فردوس کی جامد زندگی سے جہنم کی پُر اضطراب زندگی بدرجہا بہتر ہے۔

مطبوعات موصولہ

ایک افسانہ اور چار خاکے

اس کتاب میں ایک فلم ایکٹرس کی زندگی کے اُن جزئیات سے بحث کی گئی ہے جن کا علم دنیا کو بہت کم ہوتا ہے۔ اس فسانہ کے مصنف ہمارے عزیز دوست ادیب جلیل اختر شیرانی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ایک فلم اسٹار کا حال لکھنے کے لئے اختر سے زیادہ موزوں کوئی اور ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ اس موضوع کے لئے دل و دماغ میں جس گرمی کی ضرورت ہے وہ اُن میں بدرجۂ اتم موجود ہے اور مجھے یہ دیکھکر واقعی مسرت ہوئی کہ انھوں نے جزئیات تنقید کے سلسلہ میں اپنی اُن حسرتوں کو چھپانے کی کوشش نہیں کی، جن کے بغیر ایک افسانہ نگار کا فسانہ کوئی رنگ پیدا کر ہی نہیں سکتا۔

غالب نے تو صرف ایک شعر میں اس تمنا کا اظہار کر کے بات کو ضرورت سے زیادہ مختصر کر دیا، لیکن ایک نوجوان فسانہ نگار سے پوچھئے کہ جب وہ دوران تحریر میں اس منزل سے گزرتا ہے کہ:-

خدا وہ دن کرے جب اُس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

تو اس کے جذبات کا کیا عالم ہوتا ہے۔ ہر چند اختر شیرانی نے بظاہر "یہ بھی کہوں" کے ساتھ "وہ بھی" سے گفتگو نہیں کی، لیکن معناً جہاں کہیں وہ اس کا اظہار کر گئے ہیں، وہاں وہ بیدل کی زبان میں یکسر "نیمۂ داغ و نیمۂ خاکستر" نظر آتے ہیں۔

کتاب چھوٹے سائز کے ۹۰ صفحات پر شایع ہوئی ہے اور قیمت ایک روپیہ (فسانہ کی خوبی کے لحاظ سے نہیں بلکہ تجارتی نقطۂ نظر سے) زاید ہے۔ دفتر فلمستان ٹمپل روڈ لاہور سے خط و کتابت کی جاے۔

دردِ زندگی

مجموعہ ہے جناب احسان بن دانش کی نظموں کا جو رہنے والے تو کاندھلہ ضلع مظفر نگر کے ہیں لیکن بہ سلسلۂ کسب معاش کچھ زمانہ سے لاہور میں مقیم ہیں۔ آدمی نوجوان ہیں، ذہین ہیں، رنگین طبع ہیں اور ان کی ہر نظم سے ان کی شاعری کا مستقبل بہت درخشاں نظر آتا ہے۔ میں نے مستقبل کا ذکر اس لئے کیا کہ بہ حالت موجودہ ان کی شاعری عدم توازن تعبیر ناقص، اور زبان و محاورہ کی غلطیوں سے پاک نہیں ہے۔ اور مجھے افسوس ہو گا اگر جناب احسان کے احباب نے تنقید صحیح سے کام لیکر اُن کو اس بے راہ روی سے باز نہ رکھا جس کے آثار اُن کے کلام میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ میں یہاں بعض اشعار پیش کر کے بتانا چاہتا ہوں کہ جناب دانش کے کلام میں کس قسم کی خامیاں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً ان کا ایک قطعہ ہے:-

دوپہر ہونے کو ہے سنا گیا جنگل تمام　　اک کرن شاخوں سے چھنکر آ رہی ہے پھول پر

جس طرح اک گاؤں کی دوشیزۂ معصوم پر شہر کے بے غیرت و بے مہر انساں کی نظر

اول تو ستانا کوئی لفظ نہیں ہے۔ سناٹا سے سنانا فعل بنایا گیا ہے جو بالکل خلاف محاورہ ہے۔ دوسرے جو تشبیہ استعمال کی گئی ہے وہ بے محل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مشبہ اور مشبہ بہ کے درمیان ادنیٰ سی وجہ شبہ بھی فن کے لحاظ سے کافی سمجھی جاتی ہے لیکن مرکب اور متحرک تشبیہوں میں بہت زیادہ تماثل کی ضرورت ہے۔

شاخوں سے چھنکر کرن کا پھول پر پڑنا حجاب انفعال اور جھجھک کو ظاہر کرتا ہے اور شہر کے بے غیرت انسان کی نظر گاؤں کی معصوم دوشیزہ پر بیباک و بیحجاب پڑتی ہے اس لئے تشبیہ کی تعبیر ناقص ہے۔

بعض جگہ انھوں نے لفظ حسین کو فارسی لفظ سمجھکر اضافت کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ مثلاً "ذکر حسین"۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔

کہیں کہیں پنجاب کے زیر اثر انھوں نے ایسے ایسے مصرعے بھی کہہ ڈالے ہیں

تصور نے دنیا بسائی ہوئی ہے

تجلی نے گردن جھکائی ہوئی ہے

ایک جگہ انھوں نے "خورشید کی خمیدہ شعاعیں" بھی نظم کردی ہیں، ممکن ہے کہ انیشٹین انحنائے زمان (Curvature time) کی طرح کسی وقت انحنائے شعاع کا بھی قایل ہوجائے، لیکن ابھی تک تو شعاعوں کی خمیدگی کا نظریہ کسی سائنس داں نے بھی پیش نہیں کیا، شاعر کا کیا ذکر ہے۔ ایک شعر ہے۔

سوئے زمیں تھے دیدۂ میگوں جھکے ہوئے سیال میکدے تھے فضا میں رکے ہوئے

اس میں بھی وہ تعبیر و تشبیہ کا نقص ہے "دیدۂ میگوں" اس آنکھ کو کہتے ہیں جس میں شراب کا سا ہلکا رنگ پایا جائے، اس لئے اسکو "سیال میکدہ" کہنا بالکل بے معنی بات ہے اگر "دیدۂ بادہ ریز" کہا جاتا تو خیر ایک حد تک درست بھی ہو سکتا تھا۔

اسی طرح میں کے جگہ پر، سے کی جگہ کی وغیرہ کا استعمال اکثر شعروں میں غلط کیا گیا ہے۔ لیکن باوجود ان تمام خامیوں کے جناب دانش کے کلام میں ندرت و تازگی، جوش و مستی، پاکیزگی و رنگینی کی بھی کمی نہیں ہے اور کتنا اچھا ہوتا اگر ان کا کلام نقایص سے پاک ہوتا۔

ممکن ہے جناب دانش یا اُن کے احباب کو میری یہ تنقید ناگوار ہو، لیکن اگر انھوں نے کسی وقت ٹھنڈے دل سے غور کیا تو غالباً انھیں اعتراف کرنا پڑے گا کہ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے وہ یکسر خلوص و صداقت پر مبنی ہے۔

یہ مجموعہ چھوٹی تقطیع کے ۲۰۳ صفحات کو محیط ہے اور ذیشان بکڈپو مزنگ لاہور سے ۱۲ آنہ میں ملسکتا ہے۔

غالب شکن یہ ایک خط ہے جو یاس عظیم آبادی ثم یگانہ چنگیزی لکھنوی نے سید مسعود حسن صاحب رضوی ایم-اے کو لکھا تھا- اس خط میں بھی انھوں نے اسی سوقیانہ زبان وخیال سے کام لیا ہے جس نے عرصہ سے غالب کے باب میں اُن کی "تنگی چشم حسود" کی ہمیشہ آئینہ داری کی اور کرتی رہیگی کیونکہ ایسے لوگوں کے لئے "نتواں دست خزبرگ از دست" فیصلہ پہلے ہی ہو چکا ہے-

یاس ویگانہ بہ حیثیت شاعر ہونے کے کیا حیثیت رکھتے ہیں، یہ بحث اسوقت موضوع سے بالکل علحدہ ہے، لیکن اسمیں کلام نہیں کہ غالب کے مسئلہ میں انھوں نے اپنی جس فطرت کو اسوقت تک پیش کیا ہے وہ اس درجہ دنی و پست ہے کہ شاید ہی دنیائے شاعری میں کوئی دوسری نظیر اس کی مل سکے- حال ہی میں جو رباعیات غالب کے متعلق ان کی شائع ہوئی ہیں اُن کی سخیف زبان، اور ان کا بازاری لب ولہجہ ہرگز اس قابل نہیں کہ کوئی سنجیدہ انسان ان کا ذکر بھی کرے اور اسی لئے میں نے نگار میں اس پر ریویو بھی نہیں کیا کیونکہ اس بدطینتی پر روشنی ڈالنے کے لئے جو غالب کے باب میں یاس نے ظاہر کی ہے، صرف انھیں الفاظ کے استعمال کی ضرورت ہے جو خود انھوں نے استعمال کئے ہیں، لیکن یہ مرتبۂ بلند جس کو ملنا تھا ملگیا، کوئی دوسرا کیونکر جرأت کر سکتا ہے-

عہد بنی امیہ میں جب جناب امیر پر علی الاعلان مساجد میں تبرا بازی کیجاتی تھی تو امیرِ وقت نے ایک مشہور عالم کو بلا کر کہا کہ مسجد جامع میں جاکر علیؑ پر لعن کرے- ظاہر ہے کہ وہ اس سے انکار نہیں کر سکتے تھے کیونکہ خوف جان کا تھا اس لئے وہ مسجد میں گئے اور لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ "امیر المومنین فرماتے ہیں کہ میں علی پر لعنت بھیجوں اس لئے میں اُس پر لعنت بھیجتا ہوں-

اسی طرح یاس کی ہفوات نگاری کا اگر کسی سنجیدہ انسان سے کوئی جواب ہو سکتا ہے تو زیادہ سے زیادہ اسی طرح کہ یاس کی ان تمام گالیوں میں ضمیر کا مرجع خود انھیں کو قرار دیدے، لیکن میں تو کہتا ہوں کہ اتنی توجہ کرنا بھی یاس ایسے معمولی انسان کو بہت کچھ اہمیت دیدینا ہے اور میں نہیں کہہ سکتا کہ آج کیوں میں نے اپنا اتنا وقت اس شخص کے اوپر ضایع کیا-

حیرت تو مجھے ان پبلشروں پر ہے جو اس مزخرف کتابوں کو شایع کر دیتے ہیں اور پھر لطف یہ کہ ریویو کے بھی متمنی ہوتے ہیں اس رسالہ کے آخر میں بھی چند رباعیوں میں گالیوں کی نقل کی گئی ہے جن کو دیکھ کر یہ ماننا پڑتا ہے کہ اگر تناسخ واقعی کوئی چیز ہے تو یاس اگلے جنم میں بھی اس طبقہ سے تعلق رکھتے تھے جو تالیاں بجا بجا کر گالیاں دینے میں شہرت رکھتا ہے اور آیندہ بھی ان کو اسی جماعت میں جنم لینا ہے-

اس رسالہ اور نیز مجموعۂ رباعیات کی اشاعت کا فخر اُردو بک اسٹال لاہور کو حاصل ہوا ہے- جن صاحب کو ضرورت ہو وہاں سے طلب کرلیں

طلوع مجموعہ ہے ضیار صاحب فتح آبادی کے بعض اشعار کا جنھیں قطعات کے نام سے جناب ساغر نظامی نے ساغر بک ڈپو ادبی مرکز میرٹھ سے شایع کیا ہے۔ یہ قطعات صرف چار چار مصرعوں کے ہیں اور رباعیات کی طرح ان کے پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعے قوافی رکھتے ہیں گو وزن رباعی کا نہیں ہے ضیا صاحب اور ان کی شاعری سے میں اسوقت تک بدقسمتی سے ناواقف رہا حالانکہ ساغر صاحب کے نزدیک "وہ قطعی الہامی شاعر ہیں اور اس لئے پیغمبروں کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں"

افسوس ہے کہ میں اُن کی نسل کے متعلق تو کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن جس حد تک ان کی شاعری کا تعلق ہے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ مجھے اس میں کسی ایک جگہ بھی الہام کی جھلک نظر نہیں آئی۔ ساغر صاحب نے جن الفاظ میں ضیار صاحب کا تعارف کرایا ہے وہ اس درجہ مرعوب کن ہیں کہ اگر پہلے کوئی شخص ان کو پڑھ لے تو پھر احترام کلام کی صورت سوائے اس کے اور کوئی باقی نہیں رہتی کہ اس کو تعویذ بنا کر گلے میں ڈال لیا جائے یا چینی کی قاب پر زعفران سے لکھ لکھ کر تپ دق کے مریضوں کو پلایا جائے، لیکن وہ تو کہئے خیریت یہ ہوئی کہ تفسیر سے پہلے میں نے کلام دیکھ لیا اور اس عذاب سے بچ گیا۔

ساغر صاحب اگر کبھی ملے تو پوچھوں گا کہ ضیار صاحب کو کیوں آشنا بنایا گیا ہے اور اگر یہ واقعی دوست نوازی ہے تو اللہ اُنکی دوستی سے محفوظ رکھے۔

بارش اور قرآن اس وقت ایک جدید تعلیم یافتہ جماعت جو اپنے آپ کو مذہب سے بھی علٰحدہ نہیں کر سکتی، ایسی پیدا ہو گئی ہے جو علوم و فنون کے تمام نظریوں کو کلام مجید سے ثابت کرنے پر مُصر ہے اور اپنے اس دعوے کے ثبوت میں وہ "ولا رطب ولا یابس الا فی القرآن المبین" کو پیش کرتی ہے۔ اس جماعت کے ایک فرد کوئی صاحب شاکر جبل پوری ہیں، اور انھوں نے اس رسالہ میں یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ بارش کے متعلق جو جدید تحقیق یورپ نے پیش کی ہے اسکا ذکر اب سے بہت پہلے قرآن مجید میں ہو چکا ہے۔ وہ اپنی اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں، اس کا ذکر فضول ہے کیونکہ انسان اگر تاویل پر آجائے تو وہ خالق باری اور دستور الصبیاں کو بھی تمام علوم و فنون کا مخزن ثابت کر سکتا ہے، چہ جائیکہ کلام پاک جو واقعی مواعظ حکمیہ کا مجموعہ ہے۔

میں نے اس نوع کی کوشش کو کبھی نگاہ استحسان سے نہیں دیکھا، کیونکہ قرآن پاک خالص اخلاقی درس ہدایت پیش کرنیوالی چیز ہے اور اس میں علوم و فنون کی جستجو کرنا اس کی توہین ہے۔ علاوہ اس کے علمی نظرئے ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں اور اگر کلام مجید کو انھیں کے ساتھ مطابقت دینے کی کوشش کی گئی تو کل جب وہ نظرئے بدل جائیں گے تو دوسرے طریقہ کھینچ تان کے اختیار کرنے پڑیں گے اور اس طرح قرآن پاک بالکل بچوں کا کھیل ہو جائے گا۔ ممکن ہے اس کے مصنف و پبلشر اس کو اسلامی خدمت سمجھیں، لیکن میری رائے میں یہ اسلام کی تخریب ہے اور کسی طرح اہل علم کے حلقہ میں پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں

دیکھی جا سکتی - اس رسالہ کی قیمت ۸؍ ہے اور مطبع نادری جبل پور سے مل سکتا ہے۔

سمن پوش اور دوسرے افسانے مجنوں گورکھپوری کے اُن چھ افسانوں کا مجموعہ ہے جو اس سے قبل رسالۂ جنّ اور نگار میں شایع ہو چکے ہیں اور جنھیں وہ روحانیات سے نہ صرف متعلق سمجھتے ہیں بلکہ اس کا اظہار بھی کرتے ہیں۔

جناب مجنوں اُردو کے مشہور فسانہ نگاروں میں سے ہیں اور ہر چند اُن کے فسانوں میں تشاؤم کی یکسانیت کی وجہ سے کوئی تنوع نہیں پایا جاتا لیکن میر کی شاعری کی طرح عشق کی ہمت چھین لینے میں وہ ضرور ایک حد تک کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اگر ان افسانوں کا تعلق روحانیات سے ظاہر نہ کیا جاتا تو بہتر ہوتا، کیونکہ اس صورت میں ایک شخص کو اس امر پر غور کرنے کی ضرورت نہ ہوتی کہ کیا "روحانیت" اسی قسم کے مقالوں سے ثابت کی جا سکتی ہے نیز یہ کہ جس چیز کو "روحانیت" سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ صرف واہمہ پرستی تو نہیں۔ - یہ مجموعہ چھوٹی تقطیع کے ۱۶۶ صفحات کو محیط ہے اور ایک روپیہ میں دفتر ایوانِ اشاعت گورکھپور سے مل سکتا ہے۔

اُردو کا پہلا ناول نگار مسٹر اویس احمد بی۔ اے نے اس عنوان سے ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد کے سالانہ جلسہ میں ایک مضمون پڑھا تھا جو انعام کا مستحق سمجھا گیا اور بعد کو مصنف نے اسے کتابی صورت میں شائع کر دیا۔ اس میں اُردو کا پہلا ناول نگار مولوی نذیر احمد صاحب کو قرار دیا گیا ہے اور ان کی اس حیثیت کو اُن کی تصانیف سے نمایاں کر کے پورا حق تنقید ادا کیا گیا ہے۔ مسٹر اویس احمد آجکل کے نوجوان ادیبوں میں بہت پاکیزہ ذوقِ تنقید رکھتے ہیں اور جو کچھ لکھتے ہیں نہایت صاف و سلیس زبان میں لکھتے ہیں۔ - یہ کتاب ۱۲؍ میں ماڈرن بک ڈپو ہیوٹ روڈ سے مل سکتی ہے۔

جامع اللغات اُردو پاکٹ سائز اُردو لغت ہے جس میں تیس ہزار سے زیادہ الفاظ اور اُن کے مرکبات کے نہ صرف معنی بتائے گئے ہیں بلکہ یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ ایک لفظ کس زبان کا ہے، مونث ہے یا مذکر واحد ہے یا جمع، لازم ہے یا متعدی۔

میں نے جستہ جستہ اس کو دیکھا اور جس جگہ نگاہ پڑی کوئی غلطی مجھے نظر نہیں آئی۔ البتہ کہیں کہیں فارسی و عربی کے ایسے الفاظ بھی پائے جاتے ہیں جو عام طور پر اُردو میں مستعمل نہیں ہوتے۔ مثلاً سنول - غچک - غراب البین وغیرہ۔ بہتر ہوتا اگر ان کے بجائے دوسرے کثیر الاستعمال الفاظ تلاش کر کے درج کئے جاتے۔

کتاب مجلد شایع ہوئی ہے اور کتابت و طباعت بھی بُری نہیں ہے - مولوی محمد رفیع صاحب نے اس کی ترتیب میں کافی محنت و کاوش سے کام لیا ہے اور رائے صاحب رام دیال اگروالا الہ آباد نے اس کی اشاعت کر کے زبان اُردو کی قابلِ قدر

خدمت انجام دی ہے۔ قیمت بھی نہایت مناسب یعنی صرف ایک روپیہ رکھی گئی ہے تاکہ ہر اُردو داں شخص آسانی سے اسے حاصل کر سکے۔

یوسف ہندی قید فرنگ میں

غالب کے واقعات زندگی میں ایک خاص واقعہ اُن کے مقید ہو جانے کا بھی ہے۔ جس کا ذکر خود انھوں نے بھی کیا ہے۔ جناب محسن بن شبیر حیدر آبادی نے اسی واقعہ کی تفتیش و جستجو کر کے جتنی تفصیل مل سکی، مختصر سی کتاب کی صورت میں پیش کر دی ہے۔ کتاب مجلد شایع کی گئی ہے اور لکھائی چھپائی اچھی ہے۔ نہ قیمت درج ہے نہ ملنے کا پتہ، لیکن غالباً مکتبۂ ابراہیمیہ حیدر آباد سے مل سکے۔

تنقیدات عبد الحق

مولوی عبد الحق صاحب بی۔ اے سکرٹری انجمن ترقی اُردو کتابوں کا مقدمہ لکھنے اور ادبی کتابوں پر تنقید کرنے میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔ چنانچہ محمد تراب علی خاں باز حیدر آبادی نے اُن کی بعض تنقیدیں جو ۲۳ مختلف کتابوں پر رسالۂ اُردو میں شائع ہو چکی ہے علحدہ کتابی صورت میں چھاپ دی ہیں، جو طلبۂ ادب کے لئے یقیناً فائدہ سے خالی نہیں، کتابت و طباعت پاکیزہ ہے اور عہ میں کاشانۂ باز بازار گھانسی حیدر آباد دکن سے یہ مجموعہ مل سکتا ہے۔

سید الانبیاء

کارلایل کی کتاب "ہیرو اینڈ ہیرو ورشپ" نہایت مشہور کتاب ہے۔ اس میں اپنے آنحضرت کے حالات اور اسلامی تعلیمات پر تنقید کی ہے۔

محمد اعظم خاں صاحب ام۔ اے نے اس کے دوسرے لکچر کا ترجمہ (جو اس موضوع سے متعلق ہے) اُردو میں پیش کیا ہے اور پورے حُسن کے ساتھ، اس کی قیمت عہ ہے اور غالباً مکتبۂ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن سے ملسکتا ہے۔

باز کے سو شعر

تراب علی خاں باز دکن کے ایک نوجوان شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنے سو شعر کا انتخاب نہایت پاکیزہ طباعت و کتابت کے ساتھ اس نام سے شایع کیا ہے۔ اور ۸/ میں مکتبۂ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن سے مل سکتا ہے۔

خواب پریشاں

"مڈسمرس نائٹ ڈریم" شیکسپیر کا نہایت مشہور ڈرامہ ہے۔ اب سے ۳۵ سال قبل (غالباً سب سے پہلے) مولوی امیر احمد صاحب علوی بی۔ اے کاکوروی نے اس کا ترجمہ کیا تھا جو اودھ پنچ میں بالاقساط شائع ہوا۔ اب اس کو علحدہ کتابی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ شیکسپیر کے ڈراموں کا ترجمہ اُردو بہت آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ اگر کسی شخص نے شیکسپیر کے لٹریچر کی روح کو سمجھ لیا تو وہ اسمیں کامیاب ہو گیا اور جس نے صرف الفاظ کا ترجمہ کرنے کی کوشش کی وہ ناکام رہا۔

میں نے اس ترجمہ کو جستہ جستہ دیکھا اور غالباً خلاف حقیقت نہ ہوگا، اگر میں یہ کہوں کہ ایسا صاف و شگفتہ، اور اصل زبان کے جذبات کا حامل ترجمہ اس وقت تک میری نگاہ سے نہیں گزرا۔

ہمارے ملک کے نوجوان ادیبوں کو جو انگریزی ڈراموں کا ترجمہ کرنے کے شایق ہیں اس کا مطالعہ ضروری ہے۔

یہ کتاب امیر محل کاکوری (لکھنؤ) کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

بچوں کا تحفہ اس کتاب کے دو حصے ہیں اور دونوں میں بچوں کے لئے آسان، مفید و دلکش نظمیں درج کی گئی ہیں ان نظموں کے مصنف محمد شفیع الدین صاحب نیر ہیں جو ماڈرن ہائی اسکول نئی دہلی میں مدرس ہیں۔ جن عنوانات پر نظمیں لکھی گئی ہیں وہ واقعی دلچسپ بھی ہیں اور مفید بھی۔ زبان نہایت سلیس و سادہ ہے اور طرز بیان بہت سلجھا ہوا۔ جابجا تصویریں بھی نہایت پاکیزہ دی گئی ہیں اور طباعت و کتابت بھی نہایت پسندیدہ ہے۔ ہر حصہ کی قیمت آٹھ آٹھ آنے ہے اور مصنف سے مل سکتے ہیں۔

مصلحان تعلیم اس کتاب میں مغرب کے دس مصلحین تعلیم مثلاً روسو، لاک، اسپنسر، مانٹی سوری وغیرہ کے حالات اور اُن کے نظریات تعلیم سے گفتگو کی گئی ہے۔ اسوقت جبکہ بچوں کی تعلیم کا مسئلہ ہندوستان کے ہر صوبہ میں موضوع بحث بنا ہوا ہے، اس کتاب کی اشاعت بہت برمحل ہے اور ضرورت ہے کہ اس مسئلہ سے دلچسپی لینے والے اس کا مطالعہ کریں۔ یہ کتاب ۱۹۲ صفحات پر مجلد شایع ہوئی ہے اور جناب عمر یافعی صاحب۔ سن برج۔ حیدرآباد دکن سے عہ میں ملسکتی ہے۔ اس کے موٴلف ابو المکارم فیض محمد صدیقی بی۔ اے ہیں۔

روح سیاست ابراہیم لنکن، امریکہ کا بہت مشہور پریسیڈنٹ ہوا ہے۔ اس ڈرامہ میں اس کی زندگی کے جستہ جستہ واقعات پیش کئے گئے ہیں۔ پنجاب کے دو مشہور ڈرامہ نگار نور آلہی و محمد عمر صاحبان اس کے مصنف ہیں اور ۸؍ میں اُردو بک اسٹال لاہور سے ملسکتی ہے۔

حضرت امجد کی شاعری یہ کتاب حضرت امجد کا کلیات نہیں بلکہ اُن کی شاعری پر تنقید ہے جسے جناب نصیرالدین صاحب ہاشمی نے کتابی صورت میں پیش کیا ہے۔ جناب امجد حیدرآباد کے بہت مشہور شعرا میں سے ہیں اور اُس اسکول کی یادگار ہیں جس کی ابتدا نظیر اکبرآبادی سے ہوئی اور پھر حالی و اسمٰعیل میرٹھی نے جس کو ترقی دی۔ جناب امجد اخلاقی نظمیں لکھنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں اور گل و بلبل یا حسن و عشق ان کا موضوع کبھی نہیں رہا۔ وہ نہایت سہل و آسان زبان میں واقعات کی تصویر پیش کرتے ہیں اور جزئیات کے استقصار کی پوری سعی فرماتے ہیں۔ اس کتاب میں مصنف نے امجد صاحب کے تمام اصناف شاعری پر بہت قابلانہ تبصرہ کیا ہے اور اس کا مطالعہ

یقیناً دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس کی قیمت ایک روپیہ ہے اور مکتبۂ ابراہیمیہ سے مل سکتی ہے۔

وفا کی دیوی ڈراما ہے جسے ہمارے عزیز دوست مولانا کیفی چریا کوٹی نے الف لیلہ کے فسانۂ نورالدین و مریم سے اخذ کرکے بہت کچھ حذف و اضافہ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ابتدا میں ایک بسیط مقدمہ ڈراما کی تاریخ پر لکھا گیا ہے جو اسقدر دلچسپ و مفید ہے کہ اگر کتاب میں سوائے اس کے کچھ نہ ہوتا تو بھی اس کی افادیت ظاہر تھی۔ نفس ڈرامہ چونکہ اسٹیج کے لئے لکھا گیا ہے اور اسٹیج بھی اب سے پچاس سال قبل کا جب ہمارے وطن کے مشہور فرد عبداللہ فتحپوری نے ہندوستان میں اول اول تھیٹر قائم کرکے خود ہی چند ڈرامہ مقفی عبارت میں لکھے تھے۔

اس ڈرامہ میں مذاقیہ حصہ بھی کافی ہے اور اس کی شان بھی وہی ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ اگر مولانا نے اس کو صرف یہ ثابت کرنے کے لئے نہیں لکھا کہ وہ ایسا بھی لکھ سکتے ہیں، تو پھر کیوں انھوں نے یہ زحمت اختیار کی۔

یہ ڈرامہ مجلد شائع ہوا ہے اور ایک روپیہ میں رائے صاحب لالہ رام دیال اگروالہ الہ آباد سے مل سکتا ہے۔

غدودوں کے جوہر ہندوستان کے مشہور ماہر تجدید شباب لفٹنٹ کرنل ڈاکٹر محمد اشرف الحق کا یہ گیارھواں رسالہ ہے جس میں اُنھوں نے بتایا ہے کہ غدود کے جوہر سے کن امراض میں کس طرح فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے، اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ ایک جانور کے مختلف اعضا کے کھانے سے کن کن بیماریوں کو دور کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے حال ہی میں دو آپریشن دہلی میں کئے ہیں، سال گزشتہ لکھنؤ میں ایک آپریشن کیا تھا جس کا ذکر نگار میں ہوچکا ہے۔ یہ رسالہ ۶ر میں مصنف موصوف سے قلعہ گولکنڈہ حیدرآباد دکن کے پتہ پر مل سکتا ہے۔

Parsis یہ کتاب پروفیسر محمد طاہر رضوی ایم۔ اے کی تحقیق و جستجو کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے ایران کے پیمبر قدیم زردشت اور اس کے مذہب کے متعلق اتنی صحیح معلومات یکجا کردی ہیں کہ کسی اور جگہ نظر نہیں آتیں۔ اسکا ترجمہ فارسی میں بھی ہوچکا ہے اور ہمارے ایک کرمفرما مولوی وجاہت حسین صاحب ایم۔ اے اُردو میں بھی کر رہے ہیں جو نگار میں فروری سے شائع ہونا شروع ہوگا۔ یہ کتاب تین روپیہ میں تاراپوروالا اینڈ سنس ہارن بی روڈ بمبئی سے مل سکتی ہے۔

تذکرۂ معرکۂ سخن شائع ہوگیا

یہ تذکرہ اُردو زبان میں اپنی نوعیت کا بالکل پہلا تذکرہ ہے جس میں زمانۂ قدیم سے لیکر موجودہ عہد تک کے تمام مشہور شعراء فارسی و اُردو (مثلاً آتش، آرزو، آزاد بلگرامی، احسن مارہروی، اصغر گونڈوی، ڈاکٹر اقبال، امیر، انیس، بیخود، جگر، حزیں، خواجہ کرمانی، دبیر، ریاض، سودا، ظہیر، صائب، صفی، عالی، شیرازی، عزیز لکھنوی، غالب، میر، ناسخ وغیرہ وغیرہ) کے کلام پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں معہ جواب و محاکمہ یکجا کردئے گئے ہیں فن شعر و انشا کے شائقین کیلئے عجب چیز ہے

قیمت معہ محصول عہ

منیجر نگار لکھنؤ

قائد کی پہچان

مرے سینے میں اے مسلم ہیں اسرار نہاں کیا کیا
بتاتا ہوں تجھے قائد کے ہوتے ہیں نشاں کیا کیا

ابھی دم بھر میں ہر مشکل تری آسان ہو جائے
اگر دنیا میں قائد کی تجھے پہچان ہو جائے

کسے کہتے ہیں قائد رہنمائی کون کرتا ہے
غلام اقوام کی عقدہ کشائی کون کرتا ہے

وہ شیر حریت سینے میں لیکر عزم کامل کو
جب اٹھتا ہے الٹ دیتا ہے اک ٹھوکر سے باطل کو

مقابل اس کے دریا ہو تو اس میں کود جاتا ہے
کہستانوں میں رستہ زورِ بازو سے بناتا ہے

وہ شیدائے شہادت آلسا کو گلشن سمجھتا ہے
کنارِ تیغ کو جبریل کا دامن سمجھتا ہے

زمیں پہ رہ کے دم لیتا ہے جنت کی فضاؤں میں
پیامِ حق سنا دیتا ہے تلواروں کی چھاؤں میں

خلافِ مقصدِ عالی عمل کوئی نہیں کرتا
فریبِ مصلحت سے ترکِ حق گوئی نہیں کرتا

رہِ حق سے ہٹا سکتے نہیں فرزند و زن اس کو
صداقت سے پھرا سکتے نہیں دار و رسن اس کو

ہے اسکی معدلت سے مطمئن اسود بھی احمر بھی
سزا دیتا ہے وہ چوری کرے گر اس کی دختر بھی

حکومت پھانس لے تو جیل جانے سے نہیں ڈرتا
رعائت کے لئے حکام کی منت نہیں کرتا

نہیں ہوتا حوادث کے طلاطم میں ہراس اسکو
نہیں کہتا کہ زنداں میں عطا ہو لے کلاس اسکو

رہا کرتی ہے تنویرِ قناعت سے جبیں روشن
صداقت کی حمایت کرکے پھیلاتا نہیں دامن

طلا و سیم کے تاروں کو وہ نیزے سمجھتا ہے
عقیق و لعل و گوہر کو خذف ریزے سمجھتا ہے

اگرچہ تابع فرماں ہیں چین و ہند و روس اسکے
نہیں کہتا کہ نکلیں شان و شوکت سے جلوس اسکے

سفر کرتا ہے پیدل قوم سے پیسہ نہیں لیتا
اگر ملجائے گنج خسروی تو کھا نہیں لیتا

کسی کو اسکے افلاس و غنا پر شک نہیں ہوتا
دمِ رحلت مکاں میں اسکے روغن تک نہیں ہوتا

مکیں رہتی ہے صدیوں تک دلِ ملت میں یاد اسکی
نہیں ہوتی ہے بعدِ مرگ کوئی جائیداد اس کی

مخالف بھی کہا کرتے ہیں صادق اور امین اسکو
عدو بھی جانتے ہیں رحمت للعالمین اس کو
کسی کو دیکھ کر تکلیف میں بے چین ہوتا ہے
فلاحِ ابن آدم کیلئے راتوں کو روتا ہے
جلائے روح کا سامان کرتا ہے عبادت سے
دل اپنا صاف کرتا ہے ہوا و حرص و نخوت سے
عبادت کو کبھی سمجھا نہیں روزی رساں اس نے
امامت کو کبھی جانا نہیں گنج گراں اُس نے
قیادت کیلئے اقوام کو لڑوا نہیں دیتا
کبھی بھائی کی گردن بھائی سے کٹوا نہیں دیتا
کسی کی آنکھ کے شہتیر سے مطلب نہیں رکھتا
نظر آتا ہے جب تک اُسکو اپنی آنکھ کا تنکا
وہ دوش باد پر اڑنے سے پہلے پر بناتا ہے
زباں سے بعد میں کہتا ہے پہلے کر دکھاتا ہے
جو ان اوصاف کا حامل ہے بیشک رہنما ہے وہ
وگرنہ راہزن ہے بندۂ حرص و ہوا ہے وہ

اصغر حسین خان نظیر (لدھیانہ)

بہار

مولفۂ الیاس احمد ایم - اے - ایل - ایل - بی منصف سہارنپور

"گلدستۂ بہار" فارسی اور اُردو شعراء کے چوٹی کے کلام کا بہترین اور نایاب مجموعہ ہے۔ اس گلدستہ کے ہوتے ہوئے کسی کے دیوان کی ضرورت نہیں ہے چیدہ چیدہ متحد المضامین اشعار ایک خاص سرخی کے تحت میں درج ہیں۔ سرخیاں سیکڑوں ہیں۔ علم و ادب میں گلدستۂ بہار ایک دلکش اور دلفریب اضافہ ہے۔ کتاب دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ مصرع شنیدہ کَے بود مانند دیدہ - اہل ذوق ملاحظہ فرمائیں۔ ضخامت ۲۳۶ صفحے۔ قیمت معہ محصولڈاک عہ

نیجر صاحب دار المصنفین اعظم گڈھ

مظہر کمپنی کارخانہ ربڑ اسٹامپ و تامچینی

سلطان بازار (حیدر آباد دکن)

"طور"

یہیں کی تھی محبت کے سبق کی ابتدا میں نے   یہیں دیکھے تھے سب سے پہلے انداز حیا میں نے
یہیں کی جرأت اظہارِ حرفِ مدعا میں نے   یہیں پہلے سنی تھی دل دھڑکنے کی صدا میں نے

یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

حیا کے بوجھ سے جب ہر قدم پر لغزشیں ہوتیں   فضا میں منتشر رنگیں بدن کی لرزشیں ہوتیں
ربابِ دل کے تاروں میں مسلسل جنبشیں ہوتیں   خفائے ناز کی پرلطف باہم کوششیں ہوتیں

یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

بہے جاتے تھے بیٹھے عشق کے زریں سفینے میں   تمناؤں کا طوفاں کروٹیں لیتا تھا سینے میں
جو چھو لیتا میں اس کو وہ نہا جاتا پسینے میں   مئے دو آتشہ کے سے مزے آتے تھے جینے میں

یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

بلائے فکرِ فردا ہم سے کوسوں دور ہوتی تھی   سرورِ سرمدی سے زندگی معمور ہوتی تھی
ہماری خلوتِ معصوم رشکِ طور ہوتی تھی   ملک جھولا جھلاتے تھے غزل خواں حور ہوتی تھی

یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

نہ اب وہ کھیت باقی ہیں نہ وہ آبِ رواں باقی
مگر اس عیشِ رفتہ کا ہے اک دھندلا نشاں باقی

محی الدین مخدوم (عثمانیہ)

حسنِ فطرت

بہارِ شعر و ترنم ہے زندگی میری
تخیلات ہیں سیرۃ نمائے فطرت ہوں
میں اپنی نظم کا جب کردگار بنتا ہوں
کبھی ہوں حسن سراپا، کبھی ہوں عشق تمام
چمن، چمن، مجھے اذنِ خرام دیتا ہے
مری نظر میں سحر روز مسکراتی ہے

تمام رات میں تنہائیوں کے عالم میں
چمن چھیڑتا ہوں کبھی نیم خواب کلیوں کو
کبھی میں لطف اٹھاتا ہوں جوئباروں سے
ہزار جان سے صدقے بہار ہے مجھ پر
ہر ایک گل مجھے جھک کر سلام کرتا ہے
میں ڈوب جاتا ہوں جب شعریت کے طوفاں میں
گلوں کو چوم کے پڑھتا ہوں شعر مستی میں
مرے خیال کی پرواز اے معاذ اللہ
گلے لگاتا ہوں اُس حسن مستتر کو میں
مرے نیاز نے پابند کر دیا ہے اُسے
چمن بدوش ہے وہ، اور چمن میں شامل ہو
ہے اُسکا آئینہ ہر جنبشِ مظہر فطرت
میں دیکھتا ہوں اُسے بحر کی روانی میں
وہ جلوہ ریز ہے ہر سو، ہوا کی موجوں میں
نہ منتظر کوئی میرا، نہ انتظار مجھے
حسین جلووں کا ہر وقت مجھ پہ سایا ہے

نثارِ برق و تبسم ہے زندگی میری
تصورات میں صورت کشِ حقیقت ہوں
جمالِ حسن کا آئینہ دار بنتا ہوں
کبھی ہوں صبحِ مسرت، کبھی ہوں غم کی شام
شجر، شجر مرے دل کو پیام دیتا ہے
ہوائے صبح مجھے آکے گدگداتی ہے

تلاش کرتا ہوں، حسن بہار شبنم میں
میں چومتا ہوں، کبھی پر شباب کلیوں کو
کبھی میں کھیلتا ہوں جا کے آبشاروں سے
ہر ایک مظہر فطرت نثار ہے مجھ پر
غرض تمام چمن احترام کرتا ہے
دکھائی دیتا ہوں اک محویت کے طوفاں میں
میں جھوم جھوم کے پڑھتا ہوں شعر مستی میں
مری نگاہ کا اعجاز اے معاذ اللہ
جگاتا رہتا ہوں جادوئے بے خبر کو میں
مری نگاہ نے مخصوص کر لیا ہے اسے
وہ کائنات کی محفل میں، شمع محفل ہے
ہر اک کرشمہ ہے اُسکا کرشمۂ قدرت
حسین غنچوں کی مدہوش نوجوانی میں
وہ برق کی ہے روش، بادلوں کی نو جوئیں
ہے اُس سے ملنے کا ہر وقت افتخار مجھے
مرے خیال پہ ابرِ نشاط چھایا ہے

نظر، نظر میں ہے میری اسی کا کیف و سرور
ادا، ادا میں ہے اسکی مری نظر کا غرور

فطرت واسطی

حسنِ عمل

میں اس بیگانگیِ ہوش کے عالم کو کیا سمجھوں
رہینِ جہل و نادانی ہے یہ ذوقِ ہمہ دانی

سکوں کی جستجو اور صومعہ کی تیرہ خلوت میں
جہاں مجروح پائے جاتے ہیں جذبات انسانی

صدا ناقوس کی گر حاملِ رازِ سکوں ہوتی
کبھی قابو نہ پا سکتے تھے اندازِ مسلمانی

تماشہ مدتوں دیکھا ہے موجوں کی حقیقت کا
تلاطم خیز دریا بھی ہے اک جزوِ پریشانی

خدا جانے کہاں کی خاک اڑتی ہے بیاباں میں
کہیں وحشت بھی ہو سکتی ہے اک تمہیدِ لافانی

پیامِ امن کا باعث چمن کی تازگی کیوں ہو
خزاں کے سایۂ ظلمت میں ہے نظمِ گلستانی

دعا سے فائدہ کچھ بھی نہیں رونے سے کیا حاصل
چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

حدودِ زیست سے باہر نکل کر جھولیاں بھرلے
کہ ہے اس وسعتِ عالم میں جلووں کی فراوانی

بھری گرمی میں خورشیدِ قیامت جب چمکتا ہے
کنوئیں کی تہ میں جب ڈھونڈھیے سے بھی ملتا نہیں پانی

ہوائے آتشیں سطحِ زمیں پر پھیل جاتی ہے
فضا کی لرزشیں! وہ لو کی لپٹیں! اشعلہ افشانی

تڑپتی دھوپ، جلتی ریت وہ تپتے ہوئے میداں
ہوا کی شعلہ سامانی ـــ بگولوں کی پریشانی

اسی عالم میں اک مزدور دہقاں ہل چلاتا ہے
وہ اپنی لے میں وحدت کے ترانے گیت گاتا ہے

قدم رکھتا ہوا چلتا ہے اک شانِ مسرت سے
کبھی اپنے سرورِ زندگی سے جھوم جاتا ہے

بہار آتے ہی جس دم اُس کی کھیتی لہلہاتی ہے
وہ اپنی کامیابی پر خوشی سے مسکراتا ہے

حقیقت ہے کہ وہ "سازِ عمل" کو چھیڑ کر اپنے
نوائے روح کا پیغام دُنیا کو سناتا ہے

"عمل" سے دل کو ہوتا ہے سرورِ دائمی حاصل
"عمل" ہی سازِ فطرت کا ہر اک پردہ بجاتا ہے

"عمل" سے ہوگئی معراج انسانی تمدن کو
یہ کیا کم ہے "عمل" انسان کو انساں بناتا ہے

نظامِ بزم قایم ہے "عمل" کی رہنمائی میں
"عمل" کی حکمرانی ہے غرض ساری خدائی میں

شمیم

رُباعیات اثر لکھنوی

ہے شام کا وقت دم بخود ہے ساحل
کہسار پہ چھایا ہے سکوت کامل
فطرت کی خموشیوں میں گویائی ہے
محفل کو ہے انتظار میر محفل

فطرت نے لباس تازہ پھر بدلا ہے
پھر ابر بہار جھوم کر آیا ہے
پھر ہاتھ گریباں کی طرف کھنچتا ہے
پھر میں ہوں، وہی سر ہے، وہی سودا ہے

کڑھنا اور زار زار رونا اچھا
ہاں عشق کا اعتبار کھونا اچھا
لیکن کسی کافر کی نگہ سے اے دل
اب تو نہ کبھی دوچار ہونا، اچھا!

کہتے ہیں کسے عشق، مجھے کیا معلوم
اک درد ہے دلنشیں، دوا نا معلوم
نسبت اگر آغاز سے انجام کو ہے
جز تشنہ لبی، شرح تمنا معلوم

دل کو صرف عذاب رہنے تو دو
جولانگہ انقلاب رہنے تو دو
یہ ٹھوکریں کھا کے راہ پر آئے گا
کچھ دن یونہیں خراب رہنے تو دو

مذہب سے اختلاف کرتے رہئے
قبلے سے انحراف کرتے رہئے
شاید گم گشتہ مدعا مل جائے
اپنے دل کا طواف کرتے رہئے

کیفِ شبستاں

دیکھنا جذبِ محبت کا اثر آج کی رات
میرے شانے پہ ہے اس شوخ کا سر آجکی رات

اور کیا چاہئے اب اے دلِ مجروح تجھے
اس نے دیکھا ہی بہ اندازِ دگر آج کی رات

عارضِ یار پہ وہ رنگِ شفق کی لہریں
وہ مری شوخ نگاہی کا اثر آج کی رات

محوِ گلگشت ہے یہ کون مرے دوش بدوش
کہکشاں بن گئی ہر راہ گزر آج کی رات

پھول کیا خار بھی ہیں آج گلستاں بہ کنار
سنگریزے ہیں نگاہوں میں گہر آج کی رات

پھوٹ نکلا در و دیوار سے سیلابِ نشاط
اللہ اللہ مرا کیفِ نظر آج کی رات

نور ہی نور ہے کس سمت اُٹھاؤں آنکھیں
حُسن ہی حُسن ہے تا حدِ نظر آج کی رات

نغمۂ و مے کا یہ طوفانِ طرب کیا کہئے
گھر مرا بن گیا خیام کا گھر آج کی رات

نرگسِ ناز میں وہ نیند کا ہلکا سا خمار
وہ مرے نغمۂ شیریں کا اثر آج کی رات

مذہبِ عشق میں جائز ہے۔ یقیناً جائز!
چوم لوں میں لبِ لعلیں بھی اگر آج کی رات

تیرے الطاف کا اتنا ہی فسوں کافی ہے
کم ہے اے دوست مرا وردِ جگر آج کی رات

اسرار الحق مجاز (مسلم یونیورسٹی)

جذباتِ تپش

ہے نمکدان سے دل لگی مقصود
خندۂ زخم بھی ہے شور آلود

دیر کی فکر کعبہ میں بے سود
نہ سہی بُت خدا تو ہے موجود

کبھی روشن ہے دل کبھی تاریک
کبھی غائب ہو تم، کبھی موجود

منہ چھپا کر نقاب میں تم نے
نظرِ شوق کو کیا محدود

کیوں ہے عالم سیاہ نظروں میں
آتشِ عشق تھی اگر بے دود

خواب پر ہے گمانِ بیداری
غیب کو ہم سمجھ رہے ہیں شہود

کچھ نہیں ہے بجز فریبِ نظر
عالمِ نیست میں ہماری بود

کون سُنتا ہے میری عرضِ وفا
نغمہ ساز ہوں مگر مردود

سوز و سازِ تپش فضول عبث
نیست ہے ہستیِ عمل کا وجود

عبد اللطیف تپش ایم۔ اے

غزلیات

(۱)

ہم اپنے نالۂ سوزاں سے پھونک دیتے قفس
مگر قفس کی محبت سے ہوگئے بے بس

ہمارے سر سے کبھی کا گزر گیا پانی،
برس، بہار کی سرشار رات! خوب برس

اندھیری رات کے پردے میں کون ہے جو مرے
ربابِ روح کے تاروں کو کر رہا ہے مَس

چمن میں گا رہی ہیں پھول والیاں مل کر
ٹپک رہا ہے رسیلی جوانیوں کا رَس

جہاں میں بوالہوسی کے یہ کارنامے ہیں
بنا ہے وامق و فرہاد ہر کس و ناکس

مری خرابیوں کی انتہا یہ ہے اختر
خود اپنے حال پہ آنے لگا ہے مجھ کو ترس

(۲)

خواہشِ عیش نہیں دردِ نہانی کی قسم!
بوالہوس کھایا کریں عشرتِ فانی کی قسم

اک غم انگیز حقیقت ہے ہماری ہستی
قصہ خواں! تیری غم انگیز کہانی کی قسم

قلبِ ناشاد میں چھُریاں سی چلا کیں شب بھر
کسی قتال کے خنجر کی روانی کی قسم

دل کی گہرائیوں میں آگ دبی رکھتا ہوں
چشمِ گریاں سے برستے ہوئے پانی کی قسم

باغِ دنیا کی فضاؤں سے ٹپکتا ہے شباب
گلِ نوخیز کی بھرپور جوانی کی قسم

کبھی مغلوب نہ ہوگی غمِ محرومی سے
مری اُلفت ہے جواں، اپنی جوانی کی قسم

جب سے آئی ہے خدا رکھے جوانی اختر
ہم ہر اک بات پہ کھاتے ہیں جوانی کی قسم

اختر انصاری دہلوی
بی - اے (آنرز)

خواتین کے مطالعہ کی کتابیں

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
گودڑ کا لال	لعمہ/	فرائض امہات	۱۲/
شوکت آرا بیگم حصہ اول و دوم	ے/	افسانۂ نادر جہان	عمہ/
〃 حصہ سوم	ے/	اقبال دلہن	عمہ/
سعیدہ کے خطوط	عہ/	حسن معاشرت	عمہ/
پیاری سہیلی	۸/	ایامیٰ	عمہ/
نئی نویلی پیاری سہیلی	عمہ/	سولہ کہانیاں	۱۲/
عورتوں کی انشا	عہ/	سترہ کہانیاں	۱۲/
انشائے نسواں	۸/	سولہ نغمے	۸/
سیرۃ الکبریٰ	عمہ/	مراۃ العروس	۸/
طرز زندگی حصہ اول و دوم	عگا/	بنات النعش	۸/
مخدرات تیموریہ	عگا/	توبۃ النصوح	۱۲/
ازواج النبی	۱۲/	کنیز فاطمہ	۸/
ازواج الانبیا	عمہ/	بیکسی زبان	۸/
سیرۃ عائشہ صدیقہ	عگا/	نصیحت کا کرنپھول	۸/
عفت المسلمات	عمہ/	برکات سلطانی	۸/
سبیل الجنان	عگا/	ابن الوقت	عمہ/
بچوں کی پرورش	عمہ/	چند پند	۱۲/
حرز طفلاں	عہ/	منتخب الحکایات	۱۲/
تہذیب نسواں	عگا/	تندرستی	عہ/
بیوی کی تعلیم	عمہ/	حفظ صحت	عہ/
بیوی کی تربیت	عہ/	طبیب نسواں	عمہ/
تربیت اطفال	۱۲/	رہبر صحت	۸/

ناول، ڈرامے اور افسانے

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
قطرات اشک	عمہ/	موہنی	۱۲/
جلندھر ناتھ	عہ/	وداع ظفر	عمہ/
بس کا دکھ	عہ/	یاسمین شام	عمہ/
فسانۂ سعید	۸/	تخمیر ان اشک	عہ/
خوفناک ڈکیتی	عمہ/	شاہین و دراج	۸/
سیلاب اشک القصور	عمہ/	درس عشق	عمہ/
بے زبان دوست	عہ/	[illegible]	عمہ/
جمال ہمنشین	عہ/	تین بندوق باز	عمہ/
تقدیر عصمت	عہ/	کرشمۂ رقابت	۸/
جوہر قدامت	عمہ/	انقلاب قسطنطنیہ	۸/
تائید غیبی	۸/	شاہد رعنا	عمہ/
پراسرار قتل	عگا/	دنیا کی سرگزشت	۱۲/
اعلان آزادی	۵/	شگوفۂ محبت	عگا/
سرگزشت حاجرہ	۱۰/	نسوانی زندگی	۸/
نزہۂ زندگی	۱۲/	ولایتی نخبی	۱۲/
قلب حزین	۸/	شمع خاموش	۸/
عروس کربلا	عمہ/	شب زندگی کامل	عگا/
شہید مغرب	عہ/	موددہ	۸/
ماہ عجم	عمہ/	سندر کلا	۸/
تیغ کمال	عمہ/	گلستان خاتون	عمہ/
سراب مغرب	۸/	صبح زندگی	عمہ/
منازل السائرہ کامل	عگا/	شام زندگی	عہ/

تاریخ و سوانح عمریاں

کتاب	قیمت
تاریخ مغرب	عگا/
مختصر تاریخ اسلامی	عہ/
〃 〃 حصہ ۲	۹/
〃 〃 حصہ ۳	۱۰/
〃 〃 حصہ ۴	عہ/
الصالحات	عمہ/
امت کی مائیں	عہ/
الزہرا	۱۲/
اسوۂ حسنہ	۸/
ہندو شعراء	عمہ/
شو نہار	عمہ/
سوانح اکبر الہ آبادی	عہ/
سفرنامہ عراق	عہ/
تاریخ افاغنہ	عمہ/
اسلام اور غیر مسلم	۸/
سیر المصنفین حصہ ۱	عگا/
〃 حصہ ۲	عمہ/
تاریخ اسلام ۵ جلد	عہ/
اخبار الاندلس ۳ جلد	عگا/
خلافت موحدین	للعہ/
خلافت مولدین	عگا/
عرب اور اس کا مستقبل	عمہ/

لغات و ادب

کتاب	قیمت
مادری زبان	۸/
لغات سعیدی	للعہ/
لغات کشوری	سے
گنجینۂ تحقیق مجلد	للعہ/
منتخب اللغات فارسی	عگا/
محاورات نسواں	۸/
جواہر اللغات	۱۲/
گوہر اللغات	۱۴/
چراغ سخن	عہ/
دکھنی لغت	۸/
جواہرات کلیات نظیر	عمہ/
عزیز اللغات	عگا/
تذکرہ ریختی	عہ/
تاریخ اردو سے قدیم	عمہ/
دکن میں اردو	عگا/
منتخب کلام شہیدی	عگا/
رباعیات عمر خیام	عگا/
منتخب کلام ہندی	عگا/
اردو کے اسالیب بیان	عگا/
تفریح الاغلاط	۱۴/
مفصل اردو	۵/
نور اللغات ۴ جلد	للعہ/

دواوین فارسی

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
دیوان شمس تبریز	عمہ/	کلیات غالب	عمہ/	دیوان غنی کشمیری	۶/
کلیات عراقی	۱۲/	کلیات صائب	۱۴/	دیوان ہلالی	۸/
دیوان حافظ	عمہ/	دیوان ناصر علی	۸/	اسرار خودی و رموز	ے/
دیوان بیدل	عمہ/	کلیات سعدی	عمہ/	زبور عجم	ے/
دیوان عرفی	۱۴/	کلیات حزین	۱۴/	پیام مشرق	ے/
کلیات جامی	عگا/	دیوان عنصری	۱۴/	قصائد عزیز مجلد	ے/

دواوین اردو

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
کلیات ظفر	عگا/	کلیات نظیر اکبرآبادی	عہ/	صنم خانۂ عشق	عگا/
کلیات مومن	عمہ/	گلزار داغ	عمہ/	فریاد داغ	عمہ/
دیوان ناسخ	عمہ/	دیوان رند	۱۲/	عالم خیال بالتصویر	عہ/
کلیات میر	عمہ/	دیوان ذوق	۱۲/	دیوان شہیدی	۱۴/
کلیات سودا	عمہ/	گلکدۂ عزیز	عمہ/	کلیات اکبر الہ آبادی	للعہ/
کلیات انشا	عمہ/	مراۃ الغیب	عہ/	نغمۂ دل شاہجہانپوری	عمہ/

تذکرہ و تاریخ

پیغمبر اعظم عہ
شب معراج عہ/
سراج منیر عہ/
پیغمبر عالم عہ
سوانح حضرت رسول عہ/
سید المرسلین عہ
حیدر کرار عہ
سیرۃ الصدیق عا
عمر ابن خطاب عہ
ابو بکر صدیق عہ/
ائمہ اسلام ۱۲/
الحبیب عا
عمر بن عبد العزیز عیہ
دولت فاطمیہ عا
مکمل سوانح زیب النساء بیگم عہ
تذکرہ اولیا عا
تذکرہ اولیائے ہند للعہ
مراۃ الکونین عاجہ
قصص الانبیا مکمل عمہ
سفرنامہ چین عا
تمحیص التواریخ عہ/
خاتون جنت عاجہ
مخدرات الصوفیہ عہ
خواتین انگورہ عہ/
مشاہیر نسوان عہ/
مشاہیر ہند عا
مخدرات تیموریہ عا
بیگمات بنگال ۶/

جاسوسی کی ناول

شرلاک ہومز عا
محاصرہ پیرس ۸/
شیخ چلی ۴/
بہرام کی واپسی ۴/
انقلاب فرانس عہ/
بحری قزاق عہ/
نطراقی جاسوس عیہ
ترکی حرم سرا ۸/
جنگ طرابلس ۳/
بہرام جوبد ۱۲/
زر پرست ۱۲/
کیمپی کا راز ۸/
عبد الرحمن ناصر عہ/
عروس مصر عا
سیلاب خون عہ
سیاحت زمین عمہ
سیاحت ہوا عہ
نازنین مراکش ۸/
سمندر کی سیر عاجہ
اسرار بالشوزم عمہ
روح لیلیٰ ے
امین بک ۱۲/
حجاج بن یوسف عمہ
یوسف پاشا عمہ
انقلاب عثمانی عمہ
بہرام کی رہائی عمہ
بہرام کی آزادی ۱۲/
بہرام کی سرگذشت عمہ

مراثی

مراثی دبیر عاجہ
مراثی انیس کامل للعہ
مراثی ضمیر عہ/
مراثی مونس ۱۲/ ے
مراثی دلگیر ۱۲/ ے

عجائب غرائب

عجائب مخلوقات، تصویر رنگین — ۱۲/ عہ
بلا تصویر سادہ للعہ
مجمع الفنون ے
طلسم فرنگ عا
کارخانۂ عالم عہ/

زبالڈز کے ناولوں کے ترجمے

السودین ولیلیٰ عمہ
فریب حسن عا
سوزن عشق عیہ
روز الیمبرٹ للعہ
ناول اسرار عاجہ
شام جوانی ۱۲/ ے
حرم سرا ے

ناول سجاد حسین

احمق الذی ۸/
حاجی بغلول ۸/
پیاری دنیا ۸/
کایا پلٹ ۸/
میٹھی چھری ۶/
طرحدار لونڈی عہ/
طلسمی فانوس ۱۲/ عہ

ناول جوالا پرشاد

مرزالنی ۱۰/
مار آستین ۱۰/
بنگالی دولہن ۱۲/
معشوقۂ فرنگ ۸/
پرتاب ۱۲/
رذہنی ۱۰/

ناول سرشار

سیر کہسار ے
خدائی فوجدار عاجہ
جام سرشار عیہ
الف لیلہ بطرز ناول صہ
کامنی عیہ
سوانح عمر عیار عیہ

ظفر عمر بی اے

چوروں کا کلب ۹/
نیلی چھتری عمہ
بہرام کی گرفتاری عہ/

ادبی کتابیں

مکمل شرح دیوان غالب ے
بزم خیال عہ/
مشاطۂ سخن عہ/
مکاتیب محسن الملک عیہ

تذکرۃ الشعراء

تذکرہ حسینی ۱۲/
گلشن بنجار ۱۰/
سراپائے سخن عہ/
سوانح نظیر اکبر آبادی عا

ناول شرر

جنید بغدادی عہ/
مخدرات عمہ
جویائے حق للعہ
لعبت چین عہ/
فاتح و مفتوح عمہ
بابک خرمی عمہ
ایام عرب عاجہ
قیس و لبنیٰ عمہ
یوسف و نجمہ عمہ
زوال بغداد عمہ
حسن کا ڈاکو عمہ
دربار حرام پور ۱۰/
فیا بازار عہ/
مقدس نازنین عمہ
دوستۃ الکبریٰ عمہ
فلپانا عیہ
شوقین ملکہ عیہ

مولانا شبلی نعمانی

سیرۃ النبی جلد اول صہ
" " دوم للعہ
" " سوم ے
الفاروق ے
الغزالی عیہ
المامون عیہ
رسائل شبلی عیہ
موازنۂ انیس و دبیر صہ
کلام شبلی اردو عمہ
الکلام عمہ
علم الکلام عیہ
شعر العجم جلد اول عاجہ
" دوم عاجہ
" سوم عاجہ
" چہارم عاجہ
" پنجم ۱۲/

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

رجسٹرڈ نمبر ا ے
۱۱۰۴

ہر قسم کی کتابیں نگار بک ایجنسی سے طلب فرمائیے

رجسٹرڈ نمبر ا ے
۱۱۰۴